
شیرِ کشمیر
شیخ محمد عبداللہ

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ

"۔۔۔وطن اور وطن سے باہر اپنے عزیز وطن اور اہل وطن کی یہ ذلت و رسوائی دیکھ کر میرا دل پاش پاش ہوگیا، اور میں نے بے زبان کشمیریوں کے استخلاص کے لئے دعا کی اور سچے دل سے یہ حلف اٹھایا کہ میں یا تو اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کو ان مصائب سے نجات دلا دوں گا یا خود بھی صیاد کے ظلم و ستم کا شکار ہو جاؤں گا۔۔۔"

"۔۔۔ڈوگروں کے ظلم نے ہماری روحیں زخمی کردی ہیں کشمیری ایک وجیہ اور حسین قوم ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے حلیئے بگڑے ہوئے ہیں۔ یہ عمل کا وقت ہے اپنی مفلسی کو ختم کرنے کے لئے تمہیں غلامی کے ساتھ لڑنا ہوگا۔ اور اس کے لئے مجاھدوں کی طرح جہاد میں اترنا ہوگا۔۔۔"

"۔۔۔میں ان ہندوؤں سے جو ڈوگرہ راج کی جے پکارتے ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ڈوگرہ راج کیا ہے؟ اس کی بنیاد شرمناک غداری ہے۔ میں اس شرمناک غداری کا انتقام مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں سے لوں گا۔۔۔"

"۔۔۔شیخ عبداللہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ وہ بھارت یا کسی دوسری طاقت کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں۔۔۔اور کرشنا مینن کی لفاظی سے کشمیر کے الحاق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ کشمیر مینن کا نہیں، کشمیر نہرو کا نہیں، کشمیر عبداللہ کا نہیں، کشمیر چالیس لاکھ عوام کا ہے۔ اور وہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔۔۔"

"۔۔۔کشمیر کی آزادی کا فیصلہ ہمیں اپنے خون سے کرنا ہے۔ ہم سو سال کے بعد اس راج کو ختم کردینگے۔ جنگ کا بگل بجا نہیں ہے۔۔۔کسی وقت بجے گا۔۔۔"

(تقاریر کے اقتباسات)

شیرِ کشمیر

شیخ محمد عبداللہ

غدار

~~شیرِ کشمیر~~

شیخ محمد عبداللہ

تاریخِ حریتِ کشمیر کے آئینے میں

کلیم اختر

سندھ ساگر اکادمی - لاہور ۸

۲۶- بیرون لوہاری دروازہ

باراوّل ۱۹۶۳ء
طابع محمد مسعود
مطبع استقلال پریس لاہور
قیمت پندرہ روپے

جناب کے ایچ خورشید کے نام—

تعارف

کلیم اختر ریاست جموں وکشمیر کے ایک ممتاز و مرنجاں مرنج بزرگ میاں غلام علی سابق کیبنٹ سپرنٹنڈنٹ حکومت آزاد کشمیر کے فرزند ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم جموں اور ایس پی ہائی سکول سری نگر میں حاصل کی۔ ازاں بعد آپ نے مرے کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا، اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر حکومت پاکستان کی وزارتِ دفاع کے شعبہ آرڈیننس میں ملازمت کی۔ آج کل آپ "واپڈا" کے ایک ادارہ سے منسلک ہیں۔

کلیم اختر اوائل عمر ہی سے ریاست کی سیاسی و ادبی تحریکات میں حصّہ لے رہے ہیں، مضمون نگاری اور صحافت سے آپ کو خاص شغف رہا ہے۔ پاکستان کے اخبارات و رسائل میں ریاست جموں وکشمیر کے متعلق آپ نے اتنا لکھا ہے۔ شاید ہی کسی اور نے لکھا ہوگا۔ آزاد کشمیر ریڈیو سے بھی آپ کی تقریریں نشر ہوا کرتی ہیں۔ ریاست کی سیاسی جد و جہد کی پوری تاریخ آپ کو از بریاد ہے۔ اور اب تک یہ جد و جہد جن مراحل سے گزری ہے اُس کے پس منظر اور اس کی اہم شخصیتوں سے آپ پوری طرح واقف ہیں۔

ناشر

ترتیب

"جب میں پاکستان پر نکتہ چینی کرتا ہوں
تو ہندوستان والے مجھے "شیر" کا خطاب
دیتے ہیں، لیکن جب میں ہندوؤں کی فرقہ پرست
کارروائیوں کا گلہ کرتا ہوں تو مجھے "پاکستانی یا
کمیونسٹ" کہا جاتا ہے۔ جب میں کشمیر میں اقلیتوں کے
ساتھ انصاف سے پیش آتا ہوں تو میری تعریف
کے پُل باندھے جاتے ہیں لیکن میں اسی طرح
مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہوں تو مجھے
بدنام کیا جاتا ہے۔"

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ

۱۳ر جولائی ۵۲ء

نقشِ فریادی

مجھے اس کتاب کے بارے میں صرف یہی کہنا ہے کہ میں نے اُس انسان کی کہانی قلمبند کی ہے جو مردِ مومن بھی ہے اور بندۂ مظلوم بھی۔

میں نے اس کتاب میں نہ تو اس کی خوبیوں کے بیان میں مبالغے سے کام لیا ہے اور نہ اس کی خامیوں کو چھپانے کی سعی کی ہے۔ میرے پیشِ نظر یہ تھا کہ اُن سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی کیفیتوں کا تجزیہ کروں، جن میں پروان چڑھ کر وہ اپنی دکھی قوم کی دلی دھڑکنوں کا نقیب اور اُن کے مداوا کا ضامن بنا۔

یہ داستان شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کی دستاویز ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ کا رُوپ دھار جائے گی اور کشمیریوں کی آئندہ نسلیں اس بنا پر اس سے یہ مسرت بخش شعور حاصل کریں گی کہ ان کی تاریخِ حریت کو ترتیب دینے والے عظیم رہنما نے اپنی سیاسی جد و جہد میں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا، جو اُن کی قومی غیرت اور وطن کی عظمت کے لئے باعثِ ننگ ہو۔

لاہور — کلیم اختر

شخصیّت و سیاست کا تجزیہ

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں — شیخ محمد عبداللہ حقیقی معنوں میں ریاست جموں و کشمیر میں صدائے حرّیت کے سب سے بڑے نقیب، ریاستی عوام کے صحیح ترجمان اور ان کے محبوب قائد ہیں —!!!

ان کی سیاست کا نصب العین کشمیری عوام کی حقیقی آزادی اور ریاست جموّں و کشمیر کی سلامتی و ترقی ہے۔ یہ ریاست کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے سیاسیات کشمیر میں ایک آزاد اور بیباک مکتبۂ فکر و عمل کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ اُسے اپنے خونِ جگر اور سعیٔ جمیل سے پروان بھی چڑھایا۔ !!!

شیخ محمد عبداللہ کسی تحریک یا انقلاب کی پیداوار نہیں بلکہ انہوں نے خود انقلاب کو جنم دیا۔ اور تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو اپنے اخلاص و ایثار سے نشو و ارتقاء کی سمت بڑھایا بھی۔ انہوں نے درماندہ و پسماندہ اور مظلوم و مقہور کشمیری عوام کے

دکھی دلوں کی دھڑکنوں کو محسوس کیا۔ اور ایک مردِ حقیقت شناس کی طرح غیر متزلزل عزم و ایقان کے ساتھ سیاست کے پُرخار میدان میں کبھی نہ پیچھے ہٹنے والا قدم رکھا۔ اور آج بھی یہ اپنے اس عظیم الشان مسلک پر قائم ہیں۔ انہوں نے کشمیریوں کے زخمی سینوں میں دبی ہوئی آہوں کو مچلنا اور ابھرنا سکھا کر ذوقِ فریاد سے ایسا آشنا کیا جس سے ایوانِ شاہی لرز لرز اٹھا ــــ!!!

شیخ محمد عبداللہ اہلِ کشمیر کے لئے ہمیشہ ہی سامراجی قوتوں سے نبرد آزما رہے ہیں۔ ڈوگرہ شاہی سے ٹکرائے ــ بھارت سرکار سے اُلجھے اور وطن اور قوم کی سربلندی کی تمنا کے "جرم" کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں کا شکار ہوئے ہیں ــــ اور بقول مرزا بشیرالدین محمود احمد

"شیخ عبداللہ کے متعلق خود ہندوؤں نے اعلان کیا ہے کہ ان پر بڑی سختی کی جاتی ہے اور ایسے ایسے مظالم کئے جاتے ہیں جو ناقابلِ برداشت ہیں۔ مردولا سارا بائی نے ان کے متعلق اعلان کیا کہ ان پر بڑی سختی کی جاتی ہے ــــــ انہیں مارا پیٹا جاتا ہے۔ انہیں فاقے دیئے جاتے ہیں اور ان کے بیٹے فاروق عبداللہ نے کہا کہ ان کو ایسی جیل میں رکھا گیا ہے۔ جس میں سانپ اور بچھو کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں نہ نیند آتی ہے اور نہ انہیں کسی اور طرح کا آرام آتا ہے۔"

(الفضل "ربوہ" ۔ مورخہ ۹ رجولائی ۱۹۵۸ء)

پسِ دیوارِ زنداں کی یہ سختیاں اور شیخ محمد عبداللہ کا یہ عزم و استقامت اِن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل بے لوث کردار کی فضیلت اور اپنے ہم وطنوں اور مقصدِ وحید سے صالح پیمانِ وفا کی نشانی ہے ــــ چنانچہ اسی سبب سے جتنی شہرت اور ہردلعزیزی ان کو حاصل ہوئی ہے اتنی اور کسی کشمیری رہنما کو نصیب نہیں ہو سکی ــــ

شیخ محمد عبداللہ نے اس قوم کو جینے کا سلیقہ سکھایا جو صدیوں

کشمیری عوام

سے غلامی اور محکومی کی چکی میں پسے جا رہی تھی ــــ دُنیا کے "مہذب لوگ" جن کو "خفتہ بخت" قوم کے نام سے یاد کر کے ان کی سادگی اور پُرخلوص جذبۂ معصومیت پہ پھبتیاں کستے تھے اور سر جی الیگزنڈر بنڈر کھیو نگم مصنف قدیم جغرافیہ ہندوستان نے جنہیں (The Most immoral Race of India) ــــ

ہندوستان کی سب سے پست اخلاق قوم کے نام سے پکارا تھا ــــ

اور جن پر ان کے حاکموں نے اپنی ہی ارضِ جمیل اتنی تنگ کر دی تھی کہ وہ روزی کمانے پردیس جاتے تھے ــــ اور سونا اگلنے والی دھرتی کو دیکھ کہ ہر لحظہ چیخ اٹھتے تھے ؎

یہ چمن کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

جب اس مظلوم قوم کے افراد اپنے ظالم حکمرانوں کے جور و ستم سے تنگ آ کر روزی کمانے کے لئے اپنے ہمسایہ علاقوں میں جانے پر مجبور ہو جاتے تو "دیارِ غیر" کے بسنے والے انہیں "حقیر و ناتواں" ــــ "آوارہ اور بے سہارا" سمجھ کر نہ صرف قعرِ ذلت میں ڈالتے بلکہ انہیں حقارت سے "ہٹو" کہکر مخاطب کرتے۔ ان کی

اس حالت کو دیکھکر کوئی اُن پر تنقید کی بوچھاڑ کر دیتا اور کوئی تلقین کرتا ہے

تلاش رزق میں تو در بدر ہر وقت پھرتا ہے
کبھی پنجاب تیرا مستقر ہے گاہ شملہ ہے
"ہنو" کہکر تیری تحقیر سب اغیار کرتے ہیں
تیری تذلیل بھی اکثر سر بازار کرتے ہیں،
اگر تو انقلاب زندگی سے آشنا ہوتا!
تو اتنا نکبت و ادبار میں کیوں مبتلا ہوتا

(نشاطؔ)

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ حکمران طبقہ اور سرمایہ داروں کی اقتصادی۔ معاشرتی اور سیاسی تقسیم اور بندشوں نے کشمیری عوام کو مفلوک الحال مفلوج الذہن اور مٹی کے مادھو بنا رکھا تھا۔ ان کی محدود آمدنی پر ٹیکسوں کی بھرمار تھی۔

ان پر کاروبار کے تمام دروازے بند تھے۔ اور تو اور ان کے اپنی ہی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے پر پابندیاں عاید تھیں۔ جس کی وجہ سے کشمیری عوام اپنی زندگی کے خارجی و داخلی دونوں پہلوؤں سے منجمد و ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ اس ذہنی اور جسمانی غلامی کے دور میں غیر ممالک سے سیاح کشمیر کی ارضی جنت کی سیر کو آتے اور یہاں کے مرغزاروں سے لطف اندوز ہوتے۔ لیکن جب یہاں کے باشندوں کے حالات دیکھتے تو حالات کی ستم ظریفی دیکھ کر پکار اُٹھتے ہے

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ (اقبالؔ)

ان میں بعض حسّاس اور انسانیت دوست تو ان کی بے بسی پر چند آنسو بھی

بہادیتے تھے۔ لیکن اس میں ایک بیزاری کا احساس ہوتا تھا ؎

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں
کم سخن کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں
حسن و صنعت کے لئے مشہور ہیں ہم کیا کریں
ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں
ان کی صورت ہے نوشتۂ کاتبِ تقدیر کا،
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

(حفیظؔ)

روشنی کا شہر غرضیکہ جو بھی کشمیر کی وادی میں آیا۔ اس نے کشمیری عوام کی خارجی زندگی پر عاید شدہ پابندیوں کو تو دیکھا اور کبھی کبھی اس کے خلاف نعرۂ احتجاج بھی بلند کیا۔ مگر کسی نے بھی ان کے داخلی کرب، روحانی درد۔ ذہنی خوف اور سینوں میں دبی ہوئی چنگاریوں کا پوری طرح مداوا کرنے کی سعی نہ کی۔ تاوقتیکہ وادیٔ کشمیر نے اس مردِ حریت کو جنم نہ دے دیا جو غنیؔ کاشمیری کی آہ ؎

غنیؔ روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

اور علامہ اقبالؔ کی دعا ؎

نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

کا نتیجہ تھا —— اور یہ مردِ حر شیخ محمد عبداللہ تھا —— !!!

یوں خدائے عظیم و برتر نے اس ستم رسیدہ وادی کو ایک ایسے انسان سے نوازدیا جس کا مدتوں سے انتظار تھا — پھر اس نے اپنے رُوح پرور نغموں سے سوئی ہوئی مخلوق کے خوابیدہ جذبات میں حرکت و توانائی پیدا کردی — !!!

ابتدا میں شیخ محمد عبداللہ نے بھی ہزاروں۔ لاکھوں انسانوں کی طرح اپنی قوم کی کلفتوں کو نہ صرف دیکھا اور سُنا۔ بلکہ ان کا مداوا کرنے کی غرض سے خود کو فاقصص القصص لعلھم یتفکرون (انہیں ان کی داستان سناؤ تاکہ وہ سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا) — کے سانچہ میں ڈال کر علم جہاد بلند کر دیا — اور اپنے ہموطنوں سے کہا ؎

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

جب کشمیر کے چالیس لاکھ انسانوں نے اپنی داستان سنی تو ان کو یہ صدا اجنبی اور بیگانہ سی محسوس ہوئی اور وہ اپنے اس محسن کو دیوانہ اور پاگل سمجھنے لگے اور بقول چراغ حسن حسرت ؎

"نوجوانوں نے بڑے اشتیاق سے یہ واقعات سنے اور حیرت زدہ ہوکر چلا اُٹھے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ بڈھے ٹھڈوں نے جنہیں ظلم سہتے زیادہ عرصہ ہوا تھا سر ہلا کر کہا — بالکل جھوٹ۔ بادشاہوں سے کون لڑ سکتا ہے"۔

(کشمیر از حسرت صفحہ ۱۶۰)

چنانچہ اس تلخ دور اور جہالت سے پُر ایام میں شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سیاسی

زندگی کا آغاز کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ۔

"جو لوگ سفرِ حیات پر روانہ ہونے لگیں۔ وہ اس نصیحت کو کانوں کی زینت بنا لیں کہ جب تک وہ اپنی زندگی کا مقصد قرار نہ دے لیں ایک قدم بھی آگے نہ چلیں اور جب وہ اپنی زندگی کا نصب العین مقرر کر لیں تو پیچھے نہ ہٹیں تا آنکہ وہ مقصودِ حیات حاصل نہ ہو جائے۔ انہیں اس بات کی مطلق پرواہ نہ کرنی چاہیئے کہ دنیا اُسے کامیابی کے نام سے پکارتی ہے یا نامرادی اور ناکامی کا لقب دیتی ہے"۔

غرض استبداد کے سب خطرات سے بے نیاز ہو کر انہوں نے اپنے مشن کو شروع کر دیا۔ اس وقت کشمیری عوام بالخصوص مسلمانوں کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ مذہب اسلام اور دینِ محمدیؐ کی تعلیمات سے بے بہرہ اور بیگانہ ہو کر "سوادِ خانقاہی" کے چکروں میں پھنس چکے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے سب سے پہلے ان مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگاہ کر کے ان کے زنگ آلود ذہنوں کو صاف کیا اور پھر نہ صرف ان میں سیاسی شعور پیدا کیا بلکہ اُن کے ناتواں جسموں میں رُوحِ حریت پھونک کر ان کے شریکِ سفر بھی بنے اور قافلہ سالار بھی ———

اسی موقع پر ایک کشمیری شاعر نے کہا ؎

محمد عبداللہ شین کوت پہ ونٹے

دینچ از پھٹہ نونئے دارہ

(شیخ محمد عبداللہ جو برف سے زیادہ سفید ہیں۔ دین کی رسی پہ ننگے پاؤں ہی چل پڑے)

سیاسی حالت۔ نفسیاتی کیفیت

یہ تو تھا کشمیری عوام کی مذہبی حالت کا ایک پہلو۔ باقی رہی سیاسی حالت تو یہ چودھری غلام عباس کی زبان سے سنیئے۔

"اس وقت ہندوستان میں کیا ہو رہا تھا۔ سیاسی جماعتوں میں کشمکش کیوں تھی۔ سول نافرمانی اور عدم تشدد کس کو کہتے ہیں۔ ہندوستانی پریس اور پلیٹ فارم سے کیا مراد تھی۔ یہ تمام ایسی باتیں تھیں۔ جو سری نگر کے معدودے چند تعلیم یافتہ مسلمانوں کے سوا دیہات کے سادہ مزاج اور صاف دل کشمیریوں کی حدِ ادراک سے پرے تھیں۔ ان کے جسم اور ان کی روحیں حکومت کے تشدد اور متواتر غلامی کے بوجھ تلے دب دب کر نڈھال ہو رہی تھیں اس لئے ان کو بیرونی سیاست اور بیرونی لیڈرشپ کا خیال تک نہ تھا۔ انہوں نے صدیوں پہلے وادی میں کسی سیاسی تحریک کا نام سنا اور نہ کسی لیڈر کا۔ ۱۹۳۱ء میں اسلام زندہ باد کا نعرہ انہوں نے پہلی دفعہ سُنا۔"

(کشمکش از عباس صفحہ ۱۷۷)

حقیقت یہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کے مذہب و سیاست کی پریشان حالی کی وجہ جہاں حکمرانوں کا ظلم و تشدد تھا۔ وہاں اس کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ بھی تھی۔ وادی کشمیر اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ایسے معاشرے اور تہذیب میں رنگے جا چکے تھے کہ بعض اوقات ان میں

امتیاز کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ دراصل حاکموں کے "مشترکہ مظالم" نے ان میں ایک ایسا باہمی ملاپ پیدا کر دیا جس نے انہیں اپنے مذہب کے حقیقی عقاید اور روح سے بہت دُور کر دیا تھا۔ اور یہ اثراتِ نسل در نسل کشمیری عوام میں منتقل ہوتے گئے تھے اور بعد ازاں یہی اثرات سیاسیاتِ کشمیر میں داخل ہوئے، جن کو کشمیری سیاست کے ہر طبقہ خیال کے لیڈروں کو قبول نا پڑا ——— اس کے برعکس صوبہ جموں میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اور ہندوؤں کی اکثریت تھی، جس کی بنا پر مسلمان دَبے رہتے تھے اور جب کبھی وہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا نعرہ بلند کرتے تو حکومت اپنی سازش سے اس کا رُخ ہندو مسلم فسادات کی سمت کر دیتی اور تحریک کا اولین مقصد ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا تھا اور جب اس جذباتی اور وقتی جھگڑے کا اثر زائل ہو جاتا اور حالات اعتدال پر آ جاتے تو دونوں قومیں آپس میں مل بیٹھتیں[1]۔ ان حالات کے بارے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کس قدر درست کہا ہے۔

"حقیقت میں وادیٔ کشمیر میں ہندو اور مسلمان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے دونوں ایک ہی روح کی پیداوار ہیں۔ وہ آپس میں باہم شیر و شکر ہیں۔ ایک ہی خون سے ہیں۔ وہ ایک ہی زبان بولتے ہیں! ور ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے ہیں اور ایک کشمیری پنڈت ایک کشمیری مسلمان کو ریاست میں ملازمت کے وقت ایک غیر کشمیری ہندو پر ترجیح دیگا"

(ان سائیڈ کشمیر)

---

[1] جموں میں مسلم کانفرنس کے ایک ممتاز لیڈر مسٹر اے۔ آر۔ ساغر ایک عرصہ تک ہندوؤں کے مشہور سیاسی و سماجی لیڈر لالہ گردھاری لال آنند صراف کے اشتراک و تعاون سے اخبار "آنند" نکالتے رہے جس کا بنیادی نقطۂ نظر ریاستی عوام میں فکری و عملی اتحاد تھا۔ اور خود چوہدری غلام عباس ہجرت وطن تک جموں کے ایک ہندو وکیل چوہدری اندر داس سے مشترکہ وکالت کرتے رہے

اور اس ٹھوس حقیقت کو چودھری غلام عباس نے بھی تسلیم کیا ہے ——

وادیٔ کشمیر جو صرف ۸۰ میل لمبی اور ۴۰ میل چوڑی سرزمین ہے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ایک زبان بولنے والے جو خدائے قدوس کو ایک ہی رنگ، ایک ہی ڈھنگ سے مانتے تھے جن کا تمدن ایک، لباس ایک، چلنے پھرنے، کھانے پینے کا طور طریقہ ایک تھا۔ اور جو ان وجوہ کی بنا پر باہمی عزت و ناموس، ہمدردی، خیر خواہی، محبت اور مروت، اتفاق و اشتراک کے ذریعے ایک دوسرے سے پیوست تھے اور ایک مشترکہ سوز کے ذریعے ایک دوسرے کے صحیح جذبات میں اتنے رنگے ہوئے تھے کہ ان کی مثال کم از کم ہندوستان میں ملنا محال ہے ——

(کشمکش از چوہدری غلام عباس صفحہ ۱۷۶)

اس سے یہ پہلو روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ وادیٔ کشمیر کا باشندہ ذہنی قلبی، فطری اور معاشرتی طور پر ایک ایسے رنگ میں رنگا ہوا تھا، جو اس کا اپنا ہی تھا۔ اور اس کا کسی "نیشنل ازم" یا کسی اور "ازم" سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ بلکہ مسلمان مزدور ہندو پنڈتوں کے "سایہ" میں رہ کر ہندو ثقافت کے طریق کار کو اپنے عقائد میں شامل کر رہے تھے۔ اس چیز کو شیخ محمد عبداللہ نے محسوس کر لیا تھا۔ اور انھوں نے پہلے کشمیری مسلمانوں کو صحیح معنوں میں "مسلمان" بنانے اور "سوادِ خانقاہی" کے جکڑوں سے نجات دلانے کا عزم کیا اور یہی وہ پہلی منزل تھی جس کو سَر کرنے پر کسی نے انہیں "کٹر مسلمان" کے نام سے پکارا۔ کسی نے "کفر" کا فتویٰ لگایا۔ کسی نے "غدار" کہا۔ کسی نے "باغی" کا

لقب دیا لیکن وقت اس عظیم المرتبت انسان کی شخصیت اور سیاست کی صداقتوں کو نکھارتا چلا گیا۔ جس کا بنیادی اصول وسیع النظری کے سوا اور کچھ نہ تھا ـــــــ!!!

شیخ محمد عبداللہ فطرتاً اور عملاً ایک وسیع النظر سیاستدان واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے مقدس مذہبی

وسیع تر سرگرمیاں

مقامات کے واگزار ہونے کے بعد ریاستی عوام کی نفسیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی سیاسی سرگرمیوں کو ایک انقلابی صورت دے کر اس وقت وسیع تر کیا۔ جب کشمیر کے ہندوؤں کو بھی اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ ـــــ

"ڈوگرے ہمارے ہم مذہب اور ہم عقیدہ ہونے کے باوجود ہمارے نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیں اپنے پوشیدہ مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ بھی انیس بیس کے فرق سے وہی سلوک کیا جاتا ہے۔ جو یہاں کی عظیم ترین ملکی اکثریت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس محکومیت سے نجات حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ ان عوامی تحریکات میں شمولیت اختیار کی جائے۔ جو ملک کو تسلط غیر سے بچانے کے لئے بروئے عمل آ رہی ہے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں (۱۹۳۵-۱۹۳۶) کشمیر میں مجلسی اور سیاسی تحریکیں چلیں جن میں طبقاتی کشمکش کارفرما تھی۔"

(کشمیر کی سیاسی تحریکیں" از غلام احمد کشفی)

ان حالات میں جموں اور کشمیر کے لیڈروں کی اکثریت اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ ہمیں ایک ایسی سیاسی جماعت کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ جس میں تمام ریاست کے

بسنے والے بلا امتیاز مذہب و قوم شرکت کریں۔ مگر ستم یہ ہوا کہ اُسی دور میں جموں اور کشمیر کے مسلمان لیڈر آپس میں دو گروہوں میں بٹ کر مرکزی قیادت کے لئے جھگڑنے لگے۔ اور بعد ازاں یہ دونوں گروہ اپنے غیر ملکی معاونین کے مخفی مقاصد کا ذریعہ بنے۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ "تحریک آزادیٔ کشمیر" مجروح ہو کر رہ گئی ——

اُس دور میں شیخ محمد عبداللہ ہندوستانی سیاست میں آل انڈیا کانگریس کو ایک خالص ہندو جماعت سمجھتے تھے اور ان کے دل میں اس جماعت کے متعلق بدگمانیاں موجود تھیں۔ کیونکہ پنڈت جواہر لعل نہرو۔ کشمیریوں کی تحریک حریت اور اس کے بعض معاونین کے جہد و عمل کو "کشمیر میں معاشی شکایتوں کا فرقہ پرستی میں گڈمڈ ہو جانے سے تعبیر کر رہے تھے[1]۔ حالانکہ پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ استدلال بے بنیاد تھا۔ کیونکہ تحریک حریت کشمیر خالصتاً "ذمہ دار نظامِ حکومت" کے قیام کے لئے جاری کی گئی تھی اور اُسی زمانہ میں جب لندن میں مہاتما گاندھی کو گول میز کانفرنس میں کشمیر کے بارے میں سوال اٹھانے کو کہا گیا تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس سے براہِ راست مہاراجہ کشمیر پر حرف آتا تھا۔ اور بقول آغا شورش کاشمیری ——

"لندن میں گاندھی جی کے اس دعویٰ کی قلعی کھل گئی کہ وہ ہندو مسلمانوں کے نمائندے ہیں" (بخاری)

ان حالات میں شیخ محمد عبداللہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے "اپنوں" نے اُن سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی اور اغیار کو وہ اپنے لئے سود مند

---

[1] (میری کہانی صفحہ ۳۴۷ از جواہر لعل نہرو)

نہیں جانتے تھے۔ آخر شیخ محمد عبداللہ کو اپنے دیگر مسلمان دوستوں کے حاسدانہ رویہ سے تنگ آ کر خود کو حالات کے سپرد کرنا پڑا۔ اور بقول چراغ حسن حسرت —

مسلم کانفرنس نے "ذمہ دار حکومت" کا دن منایا۔ اس موقع پر جگہ جگہ جلسے ہوئے، جن میں بعض دور اندیش ہندو بھی شریک تھے۔ اس زمانہ میں کشمیری لیڈروں نے بعض مقتدر ہندوؤں سے ربط و ضبط پیدا کیا۔ کانگرسی لیڈروں سے بھی ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور شیخ عبداللہ کی طبیعت میں کانگرس کی طرف سے جو وحشت تھی وہ کم ہونے لگی۔ بعض مسلمان دوستوں نے بھی کہا کہ مسلم کانفرنس کے نام کی جگہ "نیشنل" کا لفظ رکھ دیا جائے تو کیا ہرج ہے نیشنل کا تو ظاہری لفظ ہے۔ اسے نیشنل کانفرنس کہہ لو یا کوئی اور نام رکھ لو۔ وہ ہر حالت میں مسلمانوں کی جماعت رہے گی۔ یہ دلیل کام کر گئی اور کشمیری لیڈر مسلم کانفرنس کا نام بدلنے پر آمادہ ہو گئے۔" (کشمیر از حسرت)

اب اس چیز سے یہ نتیجہ برآمد ہوا ——

کشمیر کے ہندو بھی ڈوگرہ مہاراجہ کی پالیسی سے نالاں و بیزار تھے۔

کشمیری عوام کی نفسیات کے مطابق ایک ایسی جماعت کی تشکیل ازبس ضروری تھی۔

شیخ محمد عبداللہ آل انڈیا کانگرس سے زیادہ حسن ظن نہیں رکھتے تھے۔

پھر ان حالات کی روشنی میں یہ کہنا کہ شیخ محمد عبداللہ کانگرس کے تابع ہو گئے تھے۔ یا ہندو لیڈروں کے نقش قدم پر چل پڑے تھے۔ تو یہ حقائق سے روگردانی ہوگی اصل بات تو یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے کشمیریوں کو ایک ایسی جماعت دی جو ان

کے مطالبات کی ترجمان اور ان کی نفسیات کے عین مطابق تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کشمیری عوام کی اس نفسیات سے حضرت قائدِ اعظمؒ بھی بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے انہوں نے سرینگر میں ۱۹۳۵ء میں ایک سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا ——

"ریاست میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف غیر مسلموں کی تالیف قلوب کریں۔ بلکہ ان کو سیاسی گاڑی کا ایک پہیہ سمجھ کر ساتھ چلائیں ——"

(کشمکش از چودھری عباس صفحہ ۲۱۴)

حالانکہ ادھر ہندوستان میں قائدِ اعظمؒ کا ہندوؤں کے بارے میں اپنا سیاسی نظریہ مندرجہ بالا بیان کے بالکل برعکس تھا۔ اور وہ ہندو قوم کی ذہنیت سے آگاہ ہونے کے باعث اسلامیانِ ہند کو یہ برملا کہہ رہے تھے ——

"ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی الگ الگ تنظیم کرنی چاہیئے جب یہ دونوں قومیں منظم ہو جائیں گی تو بہتر طریق پر ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گی اور اس کے بعد کسی صحیح نتیجے پر پہنچنا دشوار نہ ہوگا۔ اگر ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان منظم ہو جائیں تو ملک کی آزادی میں شاندار کردار انجام دے سکتے ہیں۔"

(تقریر قائدِ اعظم دہلی مارچ ۱۹۳۶ء مطبوعہ قائدِ اعظم صفحہ ۶۸)

اس سے یہ پوری طرح ثابت ہو گیا کہ حضرت قائدِ اعظمؒ نے بھی کشمیری عوام کی ذہنی کیفیات کو بھانپ لیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی کشمیری مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی تحریک چلانے کی تلقین نہ کرتے۔ کیونکہ اُن کا یہ درس انکے

اپنے ہی سیاسی نظریہ کے منافی تھا ——— !!!

کشمیر میں "نیشنل ازم" کی حقیقت

غرضیکہ نیشنل کانفرنس بنانے کے بعد شیخ محمد عبداللہ کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ بھی دوسرے ہندوستانی نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرح ؎

"قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھے کب کا ترک اسلام کیا"

کی عملی تصویر بن جاتے اور گاندھی جی کی اندھا دھند تقلید شروع کر دیتے گو ابتدا میں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے ان کو "کشمیر کا گاندھی" ضرور کہا۔ مگر شیخ محمد عبداللہ نے اپنے عمل سے اس "لقب" کی تردید کر دی۔ انہوں نے تو ریاستی عوام کی ضروریات کے مطابق ایک سیاسی پلیٹ فارم تیار کیا تھا۔ جو ہر لحظہ ہندو ڈوگرہ حکومت کے لئے باعث خطر اور عوام کے لئے موجب رحمت ہوا چاہتا تھا۔ اُن کے دل سے کبھی اسلام سے محبت و عقیدت کا جذبہ زائل نہ ہوا۔ اور انہوں نے سیاسی حالات کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کے لئے دراصل یہ قدم اٹھایا جس طرح حضرت قائد اعظمؒ کو مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلہ میں ہندوستان کے نوابوں جاگیرداروں اور زمینداروں کو ساتھ ملانا پڑا تھا یا پاکستان میں اقلیتوں کو اُن کے حقوق کے تحفظ کے لئے بطور ضمانت کے مسٹر جوگندر ناتھ منڈل پر اعتماد کرتے ہوئے اُسے پہلے ہندوستان کی انٹرم گورنمنٹ میں اور پھر پاکستان کی وزارت میں شامل کرنا پڑا تھا ———

یہ بات دوسری ہے کہ بعد کے سیاسی واقعات کے نشیب و فراز کے باعث وہ نہ صرف وزارت کو چھوڑ گئے بلکہ واپس کلکتہ (بھارت) چلے گئے۔ اسی طرح شیخ محمد عبداللہ کو بھی فرقہ پرستی کے خاتمے کے لئے (جو تحریک آزادیٔ کشمیر کی راہ میں ایک بڑی

رکاوٹ تھی، ہندوؤں اور بقول چراغ حسن حسرت "دوراندیش ہندوؤں" کی معاونت کی ضرورت محسوس ہوگئی اور اس بات کی تصدیق چودھری غلام عباس بھی اپنے "مخصوص انداز بیان" میں کرتے ہیں۔ جن کو حضرت قائد اعظمؒ نے یہ فرمایا تھا ــــــ

"شیخ صاحب (محمد عبداللہ) نے حال ہی میں ملاقات کے دوران میں مجھے بتایا تھا کہ نیشنل ازم محض ہندوؤں کو دھوکا دینے کے لئے ہے۔ ورنہ وہ اور اس کی پارٹی قومیت پرستی کی حامی نہیں" ــــــ

(کشمکش از چودھری غلام عباس صفحہ ۲۶۴)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نیشنل کانفرنس کی تشکیل کے موقع پر چودھری غلام عباس موجود نہ تھے۔ کیا انہوں نے اس اجلاس میں یہ ارشاد نہیں فرمایا تھا۔

کہ اب مسلم کانفرنس کا جامہ تار تار ہو چکا ہے اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس جامہ کو اتار پھینکا جائے ــــــ

(ہسٹری آف سٹرگل فار فریڈم اِن کشمیر از بزاز)

بہت ممکن ہے کہ چودھری غلام عباس نے حضرت قائد اعظمؒ کو "شیخ محمد عبداللہ کے ہندوؤں کو دھوکہ دینے کے پس منظر سے پوشیدہ رکھا ہو۔ اگر وہ حضرت قائد اعظمؒ کو شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی حیثیت اور نیشنل کانفرنس کی عوامی طاقت سے آگاہ کر دیتے تو آج کشمیر کا مسئلہ اس طرح نہ ہوتا لیکن اب کیوں چودھری غلام عباس بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ــــــ

"میں شیخ عبداللہ کو کشمیر اور پاکستان کیا دنیائے اسلام کا سب سے بڑا لیڈر تصور کرتا ہوں"۔

(نوائے وقت جون ۵۸ء)

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس ضمن میں شیخ محمد عبداللہ نے کئی بار اپنی پوزیشن کو صاف کیا، مگر مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے شیخ محمد عبداللہ کو ہمیشہ غلط رنگ میں پیش کیا اور اس بات کی تصدیق مولانا عبدالمجید سالک نے بھی کی ہے ــــــ

"میں نے ان کی (شیخ محمد عبداللہ) کانگرس نوازی حکمت عملی کے متعلق بحث شروع کر دی۔ اور کوئی دو گھنٹے تک بہت ہنگامہ رہا۔ شیخ صاحب بار بار کہتے تھے کہ میں کانگرس سے مل کر ــــــ کشمیر کو ڈوگرہ کے استبداد سے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں ــــــ"

(سرگذشت از سالک)

اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ تحریک کشمیر پر کانگرس کا کوئی اثر نہ تھا۔ کانگرس کی حیثیت محض ایک معاون کی سی تھی اور یہ شیخ محمد عبداللہ کا ہی کارنامہ تھا جس نے پنڈت جواہر لعل نہرو اور مہاراجہ ہری سنگھ والئے کشمیر کو آپس میں الجھا دیا۔ حالانکہ مذہبی عقائد کی رو سے دونوں ہندو تھے۔ باقی جہاں تک شیخ محمد عبداللہ کے رجحان کا تعلق تھا۔ اس کے بارے میں خان عبدالغفار خاں کا یہ بیان ــــــ

"شیخ محمد عبداللہ کا رجحان پاکستان کی طرف تھا۔ شیخ عبداللہ ہندو ذہنیت سے ناآشنا نہیں بلکہ انہیں پاکستان کی جانب کسی نے آج تک تدبر سے "اپروچ" نہیں کیا" ــــــ

(اقدام لاہور اکتوبر ۵۲ء)

حالات کو سمجھنے کے لئے کافی ہے ــــــ!!!

حقِ خود ارادیت کا مفہوم اب یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شیخ محمد عبداللہ بعض محب الوطن ہندوؤں کی معاونت سے آزادیٔ کشمیر کے لئے جد و جہد کر رہے تھے اور یہ بات کشمیر کے حالات کے عین مطابق تھی۔ مگر مسلم کانفرنس کے زعماء نے اسی بات کو بالکل الٹ رنگ میں پیش کر کے اس کی خوب تشہیر کی اور مسلم لیگ اور نیشنل کانفرنس (شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی جماعت) کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی جس نے دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو ایک دوسرے سے مل کر بات چیت کرنے کا بہت ہی مختصر موقع دیا حالانکہ شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقاء کار یہ کہتے رہے۔

"قومیت کا ایک جذبہ جو ۱۹۳۱ء میں کشمیریوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ابتدائی منازل طے کرتا ہوا ایک ایسے نقطے پر پہنچا جہاں اس کے لئے کسی غیر کا اپنے اوپر تسلط دیکھنا اس کی قومی اور ملی غیرت کو ایک چیلنج ہوتا ہے۔ ان دنوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کشمیری قومیت کا احساس جو سالہا سال سے بتدریج اور غیر مرئی صورت میں ریاستی لوگوں میں ابھر رہا تھا، دنوں اور ہفتوں میں اُچھالے پر اُچھالا لینے لگا۔ اور ہر کشمیری اس نئے احساس سے سرشار دکھائی دینے لگا۔ لیکن قومیت کا یہ جذبہ کسی نسلی برتری یا نفرت کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوا تھا۔ لیکن خود ارادیت کی ٹھوس اور فطری اصولوں پر اس کی تخلیق اور ترقی ظہور میں آئی تھی — کشمیری اس جذبے کے تحت جہاں اپنے لئے آزادی اور خود اختیاری کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہاں وہ ریاست میں بسنے والی چھوٹی چھوٹی قومیتوں مثلاً"

ڈوگروں اور پنجابیوں کے لئے بھی یہی مطالبہ کرتے ہیں —"

("کشمیر چھوڑ دو" —— از جی۔ ایم۔ صادق)

صرف یہی نہیں بلکہ نیشنل کانفرنس کے قائدین نے یہاں تک اپنی صفائی میں کہہ دیا کہ

"نیشنل کانفرنس تو ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کرتی رہتی ہے کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ۔ شیخ محمد عبداللہ نے یا تو مسلم لیگ کے کہنے پر لگایا۔ یا روس کی سازش سے ایسا ہوا۔ یا جواہر لعل نہرو اور ہندو کانگرس کے اشارے پر ایسا کیا گیا یا نہ جانے ایسا کیوں ہوا۔ بہر حال ان بزرگوں کو دال میں کالا دکھائی دیتا ہے اور وہ بھی مضحکہ خیز حد تک۔ یعنی اگر یہ کو مفرما گاندھی ٹوپی پہنے ہوئے ہندو سبھائی ہیں تو ان کو اس مطالبے میں مسٹر جناح اور پاکستان کی شکل نظر آتی ہے اور کوئی فرقہ پرست مسلمان بھائی ہیں تو اس میں وہ ہندو غلبہ اور ہندو کانگرس کا ہاتھ دیکھتے ہیں۔" ("کشمیر چھوڑ دو" صفحہ ۱۶)

اور اس کے ساتھ اس الزام تراشی کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا۔

"محض ذاتی تعصبات کی بنا پر رائے زنی نہ کریں کشمیر کی تحریک آزادی وہاں کے عوام کی اپنی جمہوری خواہش میں مضمر ہے۔ وہ کسی ایک شخص یا کسی ایک جماعت کی انگیخت کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ٹھیک ہے کہ کشمیری قوم اپنی آزادی کی تحریک میں ملک کی اور اسی قسم کی تحریکوں سے متاثر ہوتی رہی ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے" — ("کشمیر چھوڑ دو")

— اور اسلام سے عقیدت

اس سے یہ ثابت ہوا کہ شیخ محمد عبداللہ کے سامنے ہمیشہ ہی کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کا مسئلہ رہا اور انہوں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی کے کہنے پر تحریک چلائی اور نہ ہی کسی بنے بنائے "آشیانے" میں آبیٹھے تھے۔ انہوں نے تو اس جہاد کو اپنے فکر و عمل سے ترتیب دیا تھا۔ مگر ستم یہ ہوا کہ "ذاتی تعصبات" کی رو میں بہہ کر کشمیر کے بعض لیڈروں نے انہیں "کانگرس پٹھو" کہہ کر ہند میں اسلام کی احیاء کی تحریک کے داعیوں سے بہت دور کر دیا۔ اور ہند میں پاکستان کی تحریک کے رہنما اُن لیڈروں کے جھانسے میں آگئے جو نہ تو عملی طور پر اسلام کی حقیقی رُوح سے واقف تھے اور نہ ان کی کوئی ہمہ گیر عوامی حیثیت تھی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کو اسلام سے بے پناہ عشق و عقیدت رہی ہے اور ہے اور بقول حضرت مولانا محمد اسماعیل غزنوی مرحوم —

"تحریک اور اس کے بعد کی طویل رفاقت میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے میرے ذہن پر اپنی قومی ہمدردی کے لافانی نقوش چھوڑے ہیں۔ میں یہ بات برملا کہہ سکتا ہوں کہ شیخ عبداللہ کو خریدا نہیں جا سکتا۔ اُسے اسلام اور مسلمانوں سے بے پناہ عشق ہے۔ وہ اُن دنوں بھی باقاعدہ نماز پڑھتا تھا۔ میں نے اُس جیسا خوش الحان قرآن پڑھنے والا بہت کم دیکھا ہے وہ ارادے کا اٹل ہے۔ جس شخص میں یہ خصوصیات ہوں۔ میں نہیں مانتا کہ وہ کبھی اس فعل کا مرتکب ہو۔ جسے غداری کہتے ہیں"۔

"اقدام"۔ لاہور ۳۰ اگست ۵۳ء

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے مسٹر غلام محمد شکاری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی نے جنہیں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے، لاہور میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہیں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا۔

"شیخ محمد عبداللہ کو تاریخ ۸ اگست ۱۹۵۳ صبح ڈھائی بجے گرفتار کیا گیا۔ ایک جیپ پر شیخ محمد عبداللہ کو سوار کیا گیا۔ چار جیپیں اُن کے آگے تھیں اور چار پیچھے۔ یہ قافلہ اس جگہ پہنچا۔ جہاں کبھی پنجاب مسلم ہوٹل تھا۔ اب مسلم کا لفظ حذف کر دیا گیا ہے۔ اور یہ ہوٹل صرف پنجاب ہوٹل کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں پہنچ کر شیخ محمد عبداللہ نے جیپ کے سٹیرنگ پہ ہاتھ رکھا اور رانگہ بڑی میں ڈرائیور سے کہا کہ اگر تم نے جیپ نہ روکی تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ افسر کی اجازت سے جیپ روک دی گئی۔ شیخ عبداللہ نے ایک پیر جیپ سے باہر نکالا اور ہاتھ کے اشارے سے ان سات آٹھ آدمیوں کو اپنے پاس بلایا جو ہوٹل کے پاس تھے اور کشمیریوں کو ایک پیغام دیا۔ انہوں نے کہا "بھائیو فکر نہ کرو۔ اللہ کی رحمت برقرار ہے۔ شیخ عبداللہ غلطی کر سکتا ہے لیکن وہ غداری کبھی نہیں کرے گا"

(کوہستان، لاہور ۱۱ اگست ۱۹۶۲ء)

شیخ محمد عبداللہ مضبوط ارادے کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو عوام کی فلاح و بہبود اور اسلامی اصولوں کی تبلیغ کے لئے وقف کر رکھا ہے اور اس دینی و سیاسی نظریہ کے عشق میں ڈوب کر ذہنی طور پر ایک ایسے انسان کا روپ دھار چکے ہیں جس سے نہ تو دروغ گوئی ہو سکتی ہے اور نہ مصلحت اندیشی۔ ان کی طبیعت کے اس پہلو کے بارے میں چودھری غلام عباس نے بھی لکھا ہے کہ

"جب تک دوست ہیں تو پکے دوست۔ لیکن جب اپنی آنکھیں پھیر لیتے ہیں تو دشمنی میں بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

(کشمکش صفحہ ۱۹۰)

آخر دنیا نے دیکھ لیا کہ جب سے ان کی پنڈت نہرو سے اَن بَن ہوئی تو انہوں نے مدتوں کی دوستی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو کے کردار کو اس طرح بے نقاب کیا کہ ان کے سب دوست انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔ حالانکہ اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں تھی؛ کیونکہ شیخ عبداللہ کا تو مسلک ہمیشہ ہی رہا ہے ؎

سیاست سے انہیں نفرت مجھے کذبِ خوشامد سے
کہ ضیغم سے نہیں ممکن کبھی اندازِ روباہی

اس لئے انہوں نے قومی معاملات کو اپنے ذاتی تعلقات سے مقدم رکھتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو کو صاف کہہ دیا۔

"کشمیر بھارت کے ساتھ مکمل الحاق کبھی نہیں کرے گا۔ میں صرف کشمیریوں کی فلاح و بہبود چاہتا ہوں۔ اگر یہ مقصد مکمل خودمختاری یا پاکستان کے ساتھ ملحق ہو کر پورا ہو سکتا ہے تو میں بغیر کسی خوف کے اس سلسلہ میں آواز بلند کروں گا"

ٹائمز آف انڈیا" ۱۶ جولائی ۱۹۵۳ء

اس کے بعد بقول خان عبدالغفار خان۔

"کشمیریوں کا سچا خیرخواہ اپنی قوم کے عشق کی پاداش میں جیل میں ٹھونس

دیا گیا۔ (اقدام، لاہور)

اور پنڈت جواہر لعل نہرو بھارتی پارلیمنٹ میں ۱۰ راگست ۱۹۵۳ء کو ان الفاظ کے روپ میں اپنی ندامت و کوفت کو مٹانے لگے۔

"میرے لئے یہ امر حد درجہ اذیت بخش ہے کہ شیخ عبداللہ جو ۲۰ سال سے میرے دست و بازو رہے اس طرح ہمارے کشمیری دوستوں سے الجھ پڑے اور کشمیر سرکار کو ضرورت محسوس ہوئی کہ انہیں گرفتار کر لیا جائے"

(ٹائمز آف انڈیا)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اپنے دوستوں سے کیوں اُلجھے؟ انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے ۲۰ سالہ رفاقت کو کیوں منقطع کیا؟ اور کشمیر سرکار کو انہیں زنداں کی آغوش میں دھکیلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

اس لئے کہ انہوں نے کہا تھا —— !

"ہم اپنے داخلی معاملات میں پوری طرح آزاد ہیں اور ہم اپنے عوام کے منشاء کے مطابق اپنے مستقبل کو تراشنے کا حق رکھتے ہیں" ——

(فری پریس جرنل ۱۹ اپریل ۵۲ء)

اسی دور میں (۵۳ - ۵۲) میں نہرو سرکار نے پوشیدہ جرأت و بہادری طور پر یہ کوشش کی کہ پاکستان کی پُر آشوب سیاسی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقوام متحدہ سے کشمیر کے مسئلہ پہ "آخری فیصلہ" لے لیا جائے اور اس غرض کے لئے انہوں نے "ہندی

سیاسی فلاسفروں" کے علاوہ غیر ملکی قانونی و سیاسی ماہرین سے بھی رابطہ قائم کر لیا جن میں سر ایلین کیمبل قابلِ ذکر ہیں۔ مگر سر ایلین کیمبل نے کشمیر کی المناک کہانی کے حقائق کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو کو صاف طور پر لکھ دیا۔ کہ ــــ"

"یو۔ این۔ او میں ہندوستان کا کیس صحیح پیش نہ ہونے کی بڑی وجہ شیخ عبداللہ کی شخصیت ہے اور شیخ عبداللہ ہندوستان کی لٹیا ڈبو دے گا"

"کشمیر کی آزادی ریپبلک صفحہ ۲۔ ناشر و طابع

(جون پرچا پرلیشد ۱۹۵۲ء)

۱۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو شیخ محمد عبداللہ نے اقوام متحدہ کو جو خط لکھا، اس نے واقعی ہندوستان کی بین الاقوامی ساکھ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیا۔ اور سر ایلین کیمبل کی پیش گوئی نہ صرف درست ثابت ہوئی بلکہ سلامتی کونسل نے ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کرانے کی پھر سفارش کر دی۔ شیخ محمد عبداللہ کے اس تاریخی خط کا متن یہ ہے۔

سلامتی کونسل بھارت بارہا یہ دعویٰ کر چکا ہے کہ کشمیر نہایت برق رفتاری سے ترقی کی طرف گامزن ہے اور یہاں سیاسی تذبذب اور غیر یقینی کی کیفیت ختم ہو چکی ہے لیکن اس دعویٰ کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں کشمیر اس وقت نہایت بھیانک قوانین کی گرفت میں ہے کہ جس کی وجہ سے پوری ریاست کی سیاسی اور سماجی زندگی مفلوج ہو گئی ہے اور ترقی کے تمام راستے بھی مسدود ہیں۔

بھارت کے صدر کی منظوری سے ریاست میں احتیاطی نظر بندی کا کالا قانون

نافذ ہو چکا ہے جس نے شہری آزادیوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اس قانون کے تحت حکومت کو اختیار ہے کہ وہ جس شخص کو چاہے مقدمہ چلائے بغیر پانچ سال تک نظر بند کرے اور لطف یہ ہے کہ اس قانون کے مطابق حکومت گرفتاری کی وجہ بیان کرنے کی بھی مکلف نہیں۔ اس جنگی قانون کو بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا جا رہا ہے اور معزز شہریوں اور سیاسی کارکنوں کو محض اس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا ہے کہ وہ اسمبلی کی حزب اختلاف کی تقریروں کی تشہیر کرتے ہیں، اور پھر بھارتی اخبارات کشمیر میں رائے شماری کے تمام رجحانات کی شدّ و مد سے مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر کوئی اخبار رائے شماری کے بارے میں بھارتی وعدوں کی یاد دہانی کراتا ہے یا کشمیر کی حکومت پر نکتہ چینی کرتا ہے تو رشوت کے ذریعہ اس کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اور اگر یہ حربہ کامیاب نہ ہو تو پھر ریاست میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جاتی اور اگر کوئی نامہ نگار وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو حقائق تک پہنچنے نہیں دیا جاتا اور صورت یہ ہے کہ پوری ریاست پر آہنی پردہ تان دیا گیا ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات کو معلوم ہے مجھے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو اچانک وزارت عظمیٰ سے معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ اور اس وقت میں اپنی نظر بندی کا تیسرا سال گزار رہا ہوں۔

تحریک آزادی میں نے کشمیر میں بیس برس تک آمریت اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے خلاف ایک عوامی جدوجہد کی قیادت کی۔ اس تحریک کو اس طویل عرصہ میں بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا اور عجیب و غریب نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی بنیاد عوام کی حاکمیت

پر رکھی گئی تھی۔ میرے کئی رفقائے کار منزلِ مقصود تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی جانیں کھو بیٹھے اور اکثر نے ناقابلِ برداشت تکالیف و مصائب کا سامنا کیا — برصغیر ہند کی تقسیم نے پاکستان اور بھارت کو فرقہ وارانہ جنگ میں دھکیل دیا اور اس کے خوفناک شعلوں نے دونوں ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان فسادات کے باعث بے اندازہ جانی نقصان ہوا لیکن اس زمانے میں ریاست جموں و کشمیر نے اعتدال اور معقولیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور یہاں ایک بڑی حد تک فرقہ وارانہ یگانگت اور امن قائم رہا اور اس کے باوجود کشمیر تقسیم کے اثرات اور نتائج سے نہ بچ سکا۔ ۱۹۴۷ء میں شمال مغرب کی طرف سے قبائلیوں نے ریاست پر حملہ بول دیا۔ اس حملے کی وجہ سے ریاست کے حکمران نے بھارت سے مسلح مداخلت کی درخواست کی۔ اس مسلح مداخلت کو قانونی حیثیت دینے کی خاطر مہاراجہ نے بھارت سے الحاق کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اور بھارت نے اعلان کیا کہ یہ الحاق عارضی ہے۔ اور ریاست کے مستقبل کا فیصلہ صرف عوام کی صوابدید کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ الحاق کی پیشکش کے جواب میں بھارتی گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو تحریر کیا کہ:-

جونہی کشمیر میں امن دامان بحال ہوگا اور اس کے علاقوں کو حملہ آوروں سے خالی کرا لیا جائے گا تو کشمیر کے الحاق کا فیصلہ استصواب رائے عامہ کے ذریعے کرایا جائے گا۔

۲ر نومبر ۱۹۴۷ء کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے تقریر براڈ کاسٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم ایک بحرانی دور میں اور کشمیری عوام کو رائے کے اظہار کا موقع دیئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے الحاق کا فیصلہ خود کشمیری عوام کو کرنا چاہیئے۔ ہم اس عہد سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ اور نہ منحرف ہوں گے۔"

بھارت کے وعدے

بھارت نے اقوام متحدہ کے علاوہ کشمیری عوام سے لاتعداد وعدے کئے تھے کہ کشمیری عوام آزادانہ رائے شماری سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں بھارت نے ہمارے حق خود ارادیت کا محافظ بن کر کشمیر میں مداخلت کی تھی اور اس نعرے کا سہارا لیکر ہماری مدد سے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا۔

۱۳ر اگست ۱۹۴۸ء اور بعد ازاں ۵ر جنوری ۱۹۴۹ء کو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے دو تاریخی قرار دادیں منظور کیں۔ جن کے مطابق کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری سے ہونا چاہیئے۔ کشمیری عوام کے لئے بین الاقوامی وعدے بالکل واضح اور غیر مبہم حیثیت کے حامل ہیں۔

مجلس آئین ساز

۱۹۵۱ء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں حکومت کو آئینی شکل و صورت دینے کے لئے ایک آئین ساز اسمبلی قائم کی گئی۔ مگر پاکستان کو شبہ گزرا کہ کہیں اس اسمبلی کے ذریعے الحاق کا فیصلہ نہ کر لیا جائے۔ اس لئے پاکستان نے سلامتی کونسل میں اسمبلی کے قیام پر شدید احتجاج کیا۔ اقوام متحدہ میں بھارتی وفد کے لیڈر مسٹر بی۔ این راؤ نے ۱۲ر اور ۲۰ر مارچ ۱۹۵۱ء کو اس اسمبلی کے قیام کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا۔ کہ الحاق کے سوال پر یہ آئین ساز اسمبلی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی اور بھارت الحاق کے مسئلہ پر اقوام متحدہ سے جو وعدے کئے

گئے ہیں ان کا پابند ہو گا۔ سلامتی کونسل نے اس بناء پر اعلان کیا کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کی اس اسمبلی نے پوری ریاست یا اس کے کسی حصّہ کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے بارے میں کوئی کاروائی کرنے کی کوشش کی تو اُسے کوئی وقعت نہیں دی جائے گی۔

(کونسل کی قرارداد مارچ ۱۹۵۱ء)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اور میرے رفقاء کے خلاف ایک گہری **سازش** اور منظم سازش تیار کی گئی۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی اصل وجہ کشمیر کا تنازعہ ہے۔ اس لئے میں زور دیتا رہا ہوں کہ اس تنازعہ کو جلد از جلد اور پُرامن ذرائع سے حل کیا جائے لیکن بھارت اس رجحان اور طریق کار کا مخالف تھا اور میرے خلاف اس کاروبہ بتدریج ایک واضح عداوت کی صورت اختیار کر گیا چنانچہ بھارت نے ہمارے اتحاد کو ختم کرنے اور اپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کی خاطر ہماری صفوں میں انتشار برپا کر دیا۔ اور کشمیری عوام کو خریدنے کی کوششیں شروع کیں۔ اس کا خاتمہ ۹ اگست ۵۳ء کے انقلاب پر ہوا۔ اس رات کو علی الصبح مجھے اور میرے رفقاء کابینہ کو اچانک برطرف کر دیا گیا۔ میری گرفتاری کے ساتھ ہی میرے ہزاروں حامی اور رفقاء کار کو جن میں نائب وزیر اعلیٰ سرکاری حکام معزز تاجر قانون دان اور ارکان اسمبلی اور ممتاز شہری شامل تھے پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ بھارتی سنٹرل ریزرو پولیس، فوج ملیشیا اور اسپیشل پولیس کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ جسے چاہیں گولی ماریں، اور نہتے عوام کو ہر طرح ظلم اور سفاکی کا نشانہ بنائیں۔

بھارت بارہا یہ دعویٰ کرتا آیا ہے کہ کشمیر میں سیاسی **تشدد اور غنڈہ گردی** غیر یقینی حالت ختم ہو چکی ہے یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے۔

ریاست میں اس وقت احتیاطی نظربندی کے خوفناک قانون کا راج ہے۔ اسمبلی کے جن ارکان نے مخالف بنچوں پر بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس خوفناک قانون کے تحت ارکان اسمبلی اور حکام سے زبردستی استعفے دلوائے گئے۔ بھارتی روپیہ سے بڑی فراخدلی سے غنڈوں کی امداد اور پشت پناہی کی جا رہی ہے اور انہیں کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ ایسے شہریوں کو جو حکمران پارٹی کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے سربازار بے عزتی کریں اور کوڑے لگائیں۔ بھارت سے حاصل کی ہوئی گرانقدر مالی امداد اور قرضے عوام سے ایمان اور ضمیر خریدنے پر خرچ کئے جا رہے ہیں۔

یہ تمام مکروہ ہتھکنڈے عوام کو مطیع کرنے میں ناکام رہے ہیں اور وہ بیک آواز مطالبہ کر رہے ہیں کہ بھارت پاکستان اور اقوام متحدہ نے کشمیر میں آزادانہ رائے شماری کا جو وعدہ کیا تھا، اُسے پورا کیا جائے۔ وادی پر اس وقت عملاً ایک آہنی پردہ پڑا ہوا ہے کسی شہری کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی۔ کہ وہ کسی غیر ملکی سیاح کے پاس پہنچ کر اُسے اپنی مصائب کی داستان سنا آئے۔ میں چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی شخص میرے اس بیان کو جھٹلائے۔ اگر ایک غیر جانب دار ادارے کو تحقیقات کا موقعہ دیا جائے تو کشمیری عوام کے صحیح جذبات اور ریاست کی حقیقی صورتِ حال منظر عام پر آ جائے گی۔ کشمیر برِّ صغیر کے جسم میں ایک رِستا ہوا ناسور بن گیا ہے اس نے پاکستان اور بھارت کے تعلقات کو حد سے زیادہ کشیدہ کر دیا ہے۔ دونوں ملکوں کی فوجیں جنگ بندی سرحد پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہیں اور خطرہ ہے کہ کسی وقت بھی جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھیں کشمیر کے لئے اس کے نتائج انتہائی ہولناک ہوں گے۔ جنگ کی صورت میں کشمیر بالکل تباہ ہو جائے گا اور ممکن ہے نتائج اس سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوں

اگر اقوامِ متحدہ ایک ادارہ اتنی آسانی سے بین الاقوامی وعدوں سے انحراف کر کے لاکھوں انسانوں کے حقوق پامال کر سکتا ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ سلامتی کونسل کی افادیت پر ایک کاری ضرب لگے گی۔ اور اس سے چھوٹی قوموں کا اعتماد اٹھ جائے گا میں لاکھوں کشمیریوں کی جانب سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ سلامتی کونسل کے وعدوں پہ قائم رہیں۔ میں دنیا کی ان حریت پسند قوموں سے بھی جو اقوامِ متحدہ کے میثاق پر دستخط کر چکی ہیں اپیل کرتا ہوں کہ وہ بین الاقوامی اختلافات سے بالاتر رہ کر چالیس لاکھ کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کی حمایت کریں۔

(جنوری ۱۹۵۷ء)

مسئلہ کشمیر کے اس موڑ (Turning Point.) پر شیخ محمد عبداللہ کا یہ کردار جس بے مثال جرأت اور حق گوئی کا مظہر ہے اس کی مثال ملنی اس دور میں محال ہے اس موقعہ پر اردو کے مشہور کالم نویس "م۔ش" نے لکھا ——

"شیخ ایک انقلابی قائد ہیں۔ انہوں نے جس طرح سلامتی کونسل کے ارکان کے نام اپنا خط پہنچایا ہے اس سے اُن کی انقلابی روایات میں ایک بے مثال جرأت اور پامردی کا اضافہ ہوا ہے۔ میں نے شیخ صاحب کا خط اور پاکستان کے وزیرِ خارجہ ملک فیروز خاں نون کی وہ تقریر جو انہوں نے سلامتی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے کی خاص دِقّت نظر سے پڑھا ہے، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ ایک آدھ جزو چھوڑ کر شیخ کا خط وزیرِ خارجہ کی تقریر پر بہت بھاری تھا۔ دنیائے اسلام میں جو انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک محیط ہے سیاسی شعور کے لحاظ سے کشمیر کے مسلمان ہراول ہیں۔

انہوں نے سالہا سال تک شیر کشمیر شیخ عبداللہ کی زیر قیادت پہلے ڈوگرہ راج کے خلاف جہاد کیا اور آج وہ اسی پامردی اور جرأت سے بنیا امپیریلزم کے خلاف صف آراء ہیں۔ پاکستان کے لوگ انتہائی عقیدت اور محبت سے انہیں سلام کہتے ہیں اور اس دن کے انتظار میں بے قرار ہیں۔ جب وہ اپنی مقدس سرزمین کو بھارتی افواج کے قبضہ سے آزاد کرا لیں گے۔"

(اقدام - لاہور)

ان سب واقعات کو پیش کرنے کا مقصود صرف یہ ہے

بدگمانیوں کا شکار کہ ثابت کیا جا سکے کہ شیخ محمد عبداللہ کے قول و عمل میں صحیح اسلامی سپرٹ موجزن ہے اور انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے خدانخواستہ کبھی اسلام کی بے حرمتی نہیں کی بلکہ اس حق گوئی کی بنا پر دار و رسن کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔ مگر اسلام کے نام نہاد فدائیوں نے انہیں کافر کہا اور اپنی آغوش سے باہر پھینک دیا۔ اس لئے انہیں کشمیر کی آزادی کے لئے ان لوگوں سے معاونت طلب کرنی پڑی جن سے وہ ذہنی اور قلبی طور سے بہت دور تھے۔ اور جو (کانگرسی ہندو لیڈر) برملا کہہ رہے تھے۔

"کیا حضرت محمد صاحب کا امن کا پیغام صرف مسلمانوں تک ہی محدود تھا اور ہندوؤں اور غیر مسلموں کے خلاف تھا؟ کیا آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہی خوراک دینی ہے۔ جسے میں زہر ہی کہہ سکتا ہوں۔ جو لوگ اس قسم کا زہر مسلمانوں کے دلوں میں بھر رہے ہیں۔ وہ اسلام کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اسلام نہیں ہے۔" (مہاتما گاندھی ہریجن ۴ مئی سنہ ۴۷ء)

لیکن جب شیخ محمد عبداللہ نے مہاتما گاندھی کے سیاسی فلسفہ" کی روشنی میں اسلام کے حقیقی جذبۂ حریت کو پیش کیا تو اُن کا نائب اوّل پنڈت جواہر لعل نہرو بوکھلا گیا اور وعدہ خلافیوں پر اتر کر ہر وہ حرکت کرنے لگا۔ جو کسی ہارے ہوئے جواری کے اختیار میں ہوتی ہیں جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

"مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا۔ پہلے روپیہ کا داؤ لگاتا تھا۔ پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگانے لگا۔

("میری کہانی" از جواہر لعل نہرو صفحہ ۴۵)

محض "کشمیری" ہی نہیں

اہلِ جموں وکشمیر پر جو ظلم ہوئے، اُن کے زخم شیخ محمد عبداللہ کے سینے پر اتنے گہرے ہو چکے ہیں۔ کہ ان کو اقتدار کا نشہ یا دولت اور منصب کا لالچ بھی نہیں مٹا سکتا۔ ان کے پیشِ نظر عوام کی فلاح و اصلاح اور ترقی و سلامتی رہی ہے۔ یہی مقصدِ عظیم لے کر انہوں نے رختِ سفر باندھا اور اپنی قوم سے کہا کہ

اپنی مفلسی کو ختم کرنے کے لئے تمہیں غلامی کے ساتھ لڑنا ہوگا۔ اور اس کے لئے مجاہدوں کی طرح میدان جہاد میں اترنا ہوگا۔ ہماری جدوجہد کا نعرہ ہماری ریاست کے ہی لئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ سارے ہندوستان کے لئے ہے۔"

اور جب یہ صدا دیگر ہندی ریاستوں کے باشندوں نے سنی تو اُن کی مجبوس و محکوم روحیں بیقرار ہونے لگیں۔ اور اُن کو تاریکی میں روشنی کی کرن دکھائی دی۔ کیونکہ وہ شیخ محمد عبداللہ کی کشمیری عوام کی قومی خدمات سے آگاہ تھے۔ اس لئے

ہندی ریاستی عوام کے لیڈر آگے بڑھے اور انہوں نے ان کو آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کا صدر منتخب کر لیا۔ شیخ محمد عبد اللہ نے اس کانفرنس میں صرف عوام کے قصۂ درد کو نہ چھیڑا بلکہ ہندو کانگرس کے لیڈروں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور صاف صاف کہہ دیا۔

"میں آپ کے سامنے صرف کشمیر کی نمائندگی نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ ہندوستان کی پانچ سو اسی (۵۸۰) ریاستوں کی نمائندگی کر رہا ہوں انگریز نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک ریاستی ہندوستان دوسرا برٹش انڈیا۔ ریاستی ہندوستان میں ۱۰ کروڑ ہندو مسلمان اور سکھ بستے ہیں۔ جن پر صرف غلامی کا بوجھ ہی نہیں بلکہ وہ بے چارے چکی کے دو پاٹوں میں پسے جا رہے ہیں۔ جہاں تک آل انڈیا کانگرس کا تعلق ہے مہاتما گاندھی یا کانگرس کہتی ہے کہ ریاستی لوگ اپنی قسمت آپ بنائیں ہم ان کے معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتے لیکن ریاستوں کے ۱۰ کروڑ بدقسمت لوگ ہندوستان کے معاملات سے بیگانہ نہیں۔ بلکہ اس ملک کی غلامی کو اپنی غلامی سمجھتے ہیں"۔

(تقریر شیر کشمیر شیخ محمد عبد اللہ پولٹیکل کانفرنس پشاور ۲۳ اپریل ۱۹۴۵ء)

غرضیکہ شیخ محمد عبد اللہ نے ایک ایسے سیاسی نظام کی کامیابی کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ جو ہندی ریاستی عوام کے لئے سود مند تھا اور انہوں نے اپنی کوششوں کو نہ صرف "وادی کشمیر" یا ریاست جموں و کشمیر" کے عوام تک ہی محدود رکھا بلکہ اس کا دوسرا زینہ ہندوستان کے ریاستی عوام کو بنایا۔ اس لئے انہوں نے ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کے لدھیانہ سیشن میں ہندوستان کی تمام ریاستوں

کے عوام کے لئے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کر دیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس کانفرنس کی صدارت پنڈت جواہر لعل نہرو نے کی تھی۔ جن کے خطبہ صدارت کے الفاظ آج بھی ریاستی عوام کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ مگر خود اُن کے اپنے کان ریاستی عوام کے مطالبات سننے کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ غرضیکہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس کانفرنس میں کہا تھا۔

"یہ کانفرنس سختی سے مطالبہ کرتی ہے کہ ان تمام معاہدوں کو جو بوسیدہ اور ناقابل عمل ہو چکے ہیں فوری طور پر منسوخ کر دیا جائے۔ اور اقتدار اعلیٰ کو چاہیئے کہ وہ ایسے راجوں اور حاکموں کی امداد کرنے یا حفاظت کرنے سے انکار کر دے۔ جو اپنی ریاستوں میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے کے درپے ہیں"۔ ہم کسی ایسے نظام حکومت کو برداشت نہیں کریں گے۔ اور ہم کسی بھی صورت میں ان کو برداشت نہیں کرینگے ہم ایک واحد اور آخری اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور وہ عوام کی خواہش ہے۔ ہمارے پیش نظر ایک ہی چیز ہے جس پر تمام تر دارومدار ہے اور وہ عوام کی بہتری ہے"۔ (جواہر لعل نہرو)

اب یہ بات کون کس سے کہے ؟ کہ مندرجہ بالا الفاظ کے خالق پنڈت جواہر لعل نہرو نے کس طرح عوام کی خواہشات کو کچلا۔ عوام کو کس طریق سے دھوکا دیا۔ اور "گاندھی ازم" کی دھجیاں کس طرح فضائے آسمانی میں بکھریں۔ درحقیقت کانگرسی ہندوؤں کا یہ ایک فراڈ تھا۔ اور اس فراڈ کے بارے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے درست کہا ہے ——"

"گاندھی ازم" ایک طرف رام راجیہ اور قدیم برہمنی تہذیب کے احیاء کا خواب دیکھتا تھا۔ دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے اکٹھا

کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ باتیں متضاد اور غیر عقلی تھیں لہٰذا گاندھی ازم ناکام ہوا"

(آزاد کشمیر)

مگر اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ اپنے قول پر قائم رہے اور بھارت کی دولت اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی رفاقت انہیں اپنے مسلک سے ہٹا نہ سکی اور انہوں نے باشندگان بھارت کو کہہ دیا ——"

بھارت کے کسی شخص کو یہ محسوس نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اہل کشمیر بھارتی سرمائے تجارت یا فوجی طاقت کے محتاج ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہیں ایسے جذبات کسی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے۔ میں بھارت کو متنبہ کرتا ہوں کہ اگر اس کی خواہش یہی ہے تو کشمیر الحاق کے بارے میں اپنے معاہدے توڑنے کو تیار ہے ہم کسی کو غلام بنانے کے خواہشمند نہیں ہیں۔ ہم کسی کے غلام بننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔"

(تقریر شیخ محمد عبداللہ یوم معراج شریف) حضرت بل ۲۵ اپریل ۱۹۵۲ء

(مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا)

تعمیر پسند انسان مشہور فرانسیسی ادیب رومن رولاں کا قول ہے کہ "جو ظلم ہوتا دیکھے اور اس کے خلاف جہاد نہ کرے وہ خود بھی ظالم ہے۔ وہ عقل و فکر جو عملی صورت اختیار نہ کرے عقل کی غداری اور فکر کا اسقاط ہے"

اس قول کی روشنی میں اگر ہم شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی کردار کو پرکھیں تو وہ اس پر ہر لحاظ سے پورے اترتے ہیں لیکن بعض اوقات اپنے معاملات کو طے کرنے کے لئے جلد بازی بھی کر گئے حالانکہ اس جلد بازی کی وجہ سے ان کو سخت نقصانات بھی ہوئے اور بقول

چراغ حسن حسرت :۔

"شیخ عبداللہ کی طبیعت میں طوفان کا انداز ہے کہ جدھر رُخ پھر گیا۔ پھر گیا۔ اپنے زور میں اس طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ پلٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس عجلت پسندی اور سرشوری نے کشمیر کی تحریک کو بہت سے نقصان پہنچائے ہیں لیکن سچ پوچھو تو ان کی یہی ادائیں ہیں جو کشمیریوں کو بہت پسند ہیں شیخ صاحب پر مذہب کا بہت گہرا اثر پڑا ہے"——

شیخ محمد عبداللہ نے کشمیری عوام کی بیداری کے لئے ہندوستان کے مشہور و معروف شعرائے کرام سے کشمیر کے بارے میں منظومات لکھوائیں، مضامین تحریر کروائے۔ کتابیں قلمبند کرائیں۔ فلاحی اور اصلاحی ادارے قائم کئے۔ یتیم خانوں کو" کاروباری پیشہ ور لوگوں کی منحوس گرفت سے آزاد کرایا۔ ہر کاروباری حلقے کی تنظیم کی اور عوام کی بہتری کے لئے جہاں مناسب جانا حکومت سے تعاون بھی کیا۔ اور جب اپنا منشا حکومت کے برعکس پایا تو ــــ

"پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر"

کی عملی تصویر بنے۔ ان کی تعمیری سرگرمیاں انقلابی جدوجہد اور ہنگامی حالات میں بھی جاری رہیں اور جب انہوں نے ۱۹۴۸ء میں ریاست جموں وکشمیر کے چیف ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے عنان حکومت سنبھال لی تو جنگ کے باوجود انہوں نے تعمیر و ترقی کی طرف توجہ دی۔ جہاں ایک طرف وہ جموّں کے فسادات پر جموں شہر کے متعصب اور سنگ دل ہندوؤں کو ڈانٹ رہے تھے کہ

"اے جموں کے ہندوؤ! آپ نے اپنے مسلمان بھائیوں کو دھوکے

اور فریب سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ تم نے ان کی جائیدادوں کو لوٹا ہے۔ ان کے گھروں کو جلایا ہے۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی ہے۔ اس پر قدرت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یاد رکھو یہی حالات درونِ کشمیر میں بسنے والے غیر مسلموں سے بھی پیش آسکتے ہیں۔ اب نکھیوں کو یہ شہر چھوڑ کر جانا ہوگا۔ اب ان کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ آپ سب لوگ اپنے وطن اور لوگوں کے دشمن ہیں ——" (تقریر عجائب گھر جموں)

وہاں دوسری سمت جموں کے بچے کھچے مظلوم اور مجروح مسلمانوں کو اکٹھا کر کے پھر سے آباد کرانے میں مصروف تھے۔ زخمیوں کو ہسپتال لے جا رہے تھے۔ لاوارث بچوں کو سرینگر بھیج رہے تھے۔ جہاں ان کے لئے مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندو سکھ شرنارتھیوں کی بھی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اور کاروبار سلطنت بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ اس دور میں کشمیر یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اور ریاست میں سب سے بڑی عمارت ہائیکورٹ کی تعمیر کا حکم دیا۔ بعد ازاں یہی باتیں خود ان کے حق میں بری ثابت ہوئیں۔ لیکن انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے آگے جھکنے کی بجائے اپنے عوام کی جانب رُخ کیا۔ اور ان کو فیض کی زبان میں کہا:

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے

جسم و زبان کی موت سے پہلے

بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے"

اور کشمیریوں نے "پولیٹیکل کانفرنس" اور "محاذ رائے شماری" کو وجود میں لا کر جو کچھ

کہنا تھا کہا۔ تمام وادی میں بغاوت کے شعلے پھیل گئے۔ ہندی سنگھیوں نے اسلامیانِ توحید کو شہید کر دیا۔ عالمی رائے عامہ کا خوابیدہ ضمیر نہ صرف زندہ ہوا بلکہ "دو بھائیوں"[1] کے بے بنیاد باہمی ملاپ کے درمیان سویا ہوا کشمیر کا مسئلہ پھر جاگ اُٹھا۔

مجرم کون

جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت و سیاست کو پاکستان عوام کے سامنے جس غلط اور بدترین رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ پاکستان اور کشمیر دونوں کے لئے ایک بہت بڑے سانحہ سے کم نہیں ہے۔ اگر پاکستان کے لیڈروں اور کشمیر کے لیڈروں (شیخ محمد عبداللہ گروپ) کے درمیان غلط فہمیاں نہ پھیلائی جائیں اور دونوں خطوں کے لوگ اس سے بری طرح متاثر نہ ہوتے۔ تو آج وہ حالات نہ ہوتے جو ہیں۔ گلہ تو یہ ہے کہ "بدگمانیوں" کے اس دور میں کسی بھی با اثر شخصیت یا کسی بھی مخلص اور با اثر جماعت نے نہ تو دیانتداری کے ساتھ شیخ محمد عبداللہ اور اُن کی پارٹی کے لائحہ عمل کو پرکھا اور نہ ہی اُن کے سیاسی طریق کار کو ہمدردانہ نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کشمیر کے بعض سیاسی لیڈر کسی طور پر بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ کہ شیخ محمد عبداللہ پاکستان کے قریب آجائیں اور اس طرح اُن کی لیڈری کا چراغ گل ہو جائے اور اسی ایک بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں نے عوام میں (پاکستانی عوام) شیخ محمد عبداللہ کے خلاف بہتان تراشیاں شروع کر کے مسلم لیگ کو براہ راست ریاستوں کے معاملہ میں دخل نہ دینے کا مشورہ دے دیا تھا۔ اور خود کچھ بھی نہیں کیا، بلکہ ان لوگوں نے مسلم لیگ ہائی کمان کو بھی

---

[1] پنڈت جواہر لعل نہرو میرے بڑے بھائی ہیں (وزیر اعظم پاکستان محمد علی بوگرا)

تاریکی میں رکھا۔ جو پہلے ہی سیاسیات میں اپنی بے انتہا مصروفیات کی وجہ سے ریاستوں کے معاملہ پر پوری توجہ نہیں دے رہی تھی۔ اور بقول "مصنف تاریخ مسلم لیگ"۔

"مسلم لیگ ریاستوں کے معاملات و مسائل میں براہ راست حصّہ نہیں لیتی بریاستہائے ہند کے معاملات و مسائل سلجھانے کے لئے ایک الگ اور مستقل ادارہ سٹیٹس مسلم لیگ موجود ہے اور پوری مستعدی و سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے" (تاریخ مسلم لیگ صفحہ ۴۵۸)

لیکن اس ادارہ کی "مستعدی و سرگرمی" سے خود مسلم لیگ ہائی کمان کے بڑے بڑے ارکین بھی ناواقف تھے اور اس ادارہ کا وجود محض کاغذی کاروائی سے آگے نہ بڑھ سکا۔

کیونکہ اس ادارہ کے کسی کام یا کسی کاروائی کا کوئی نشان ساری تحریک مسلم لیگ میں نہیں ملتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس ادارہ کے لوگوں میں چودھری غلام عباس بھی شامل تھے جو ریاست جموں وکشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کے سب سے بڑے سیاسی حریف تھے۔ اس لئے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ چودھری غلام عباس اپنے ادارہ کی معرفت یا وساطت سے ریاست جموں وکشمیر کے صحیح حالات مسلم لیگ ہائی کمان تک پہنچاتے۔ جب کہ اُن کی اس "حقیقت بیانی" سے خود ان کی سیاسی حیثیت ختم ہو جاتی تھی۔ نتیجتہً مسلم لیگ ہائی کمان نے مسلم کانفرنس اور چودھری غلام عباس پر اعتماد کیا حالانکہ اس وقت شیخ محمد عبداللہ پر اعتماد کرنا چاہیئے تھا جن کی عوامی حیثیت مسلّمہ بھی تھی اور دور رس بھی!!

حقیقتِ حال

یہاں اُن حالات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو ۴۷-۱۹۴۶ء میں پیش آئے اور اس پس منظر میں اس مسئلے کو زیادہ وضاحت

سے سمجھا جا سکے گا۔

اوّل۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر تقسیم ہوا۔ اس وقت شیخ محمد عبداللہ "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کے سلسلے میں جیل کی تنہائیوں میں دن گزار رہے تھے اور مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت ہندوستان اور پاکستان کی دونوں نوزائیدہ ڈومینینوں سے جوں کا توں (stand still.) معاہدہ کر چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک اور خفیہ سازش سے پنجاب باؤنڈری کمیشن کے ایک رُکن مسٹر مہر چند مہاجن سے ایک ایسا معاہدہ کر چکی تھی۔ جس کی رُو سے مسٹر مہر چند مہاجن کو پانچ سال کے لئے کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا۔ اس معاہدہ کی تہہ میں یہ تھا کہ باؤنڈری کمیشن کشمیر کو بھارت کے ساتھ ملانے کے لئے مشرقی پنجاب کے بعض حصّوں کی تقسیم اس طرح کرے گا کہ کشمیر کا بھارت سے تعلق قائم کیا جائے۔ غرضیکہ اگر مسٹر مہر چند مہاجن کا تقرر کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی ایک کڑی تصور کیا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

دوئم۔ آل انڈیا کانگرس ہائی کمان کے مقتدر اراکین مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، آچاریہ کرپلانی اور لارڈ لوئی مونٹ بیٹن تک سری نگر آ کر مہاراجہ کشمیر کو شیشہ میں اتارنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ اور انہی دنوں مہاراجگان پٹیالہ، کپورتھلہ اور فرید کوٹ بھی سری نگر آئے اور مہاراجہ کشمیر کے مہمان بنے رہے۔

سوئم۔ مشرقی پنجاب کی ہندو اور سکھ ریاستوں کے ان حکمرانوں نے مہاراجہ کشمیر کو بوقت ضرورت امداد دینے کا ہر ممکن وعدہ کیا تھا۔ اور واقعات شاہد

ہیں کہ سکھ ریاستوں کی افواج نے کشمیر کی جنگ اور جموں کے فسادات میں ہندوؤں کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ اور اسلامیانِ ریاست کو نیست و نابود کرنے کی مذموم سازش میں شرکت کی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ ہائی کمان کشمیر کے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر رہی اور وہ اس مسئلہ کو یا تو غیر سنجیدگی سے دیکھتی رہی یا پھر ضرورت سے زیادہ خوش فہمیوں میں مبتلا تھی۔ حالانکہ اس وقت کئی لوگوں نے جن میں ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر مرحوم قابلِ ذکر ہیں صحیح صورتِ حال سے حضرت قائدِ اعظمؒ کو آگاہ بھی کر دیا تھا۔ اور بقول ڈاکٹر تاثیر:-

تیسری بار دہلی میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ قائد اعظم تھے۔ دہلی میں کشمیر کے سلسلے میں بات ہوئی۔ مجھے اُن کے طریقِ کار سے اطمینان نہیں تھا اور اُسے خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔ (ماہِ نو قائد اعظم نمبر ۱۹۵۰ء)

ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق مولانا عبد المجید سالک بھی کرتے ہیں:-

"ڈاکٹر تاثیر نے کشمیر کے سلسلے میں نہایت قیمتی خدمات انجام دیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ کبھی وقت آئے گا تو معلوم ہو گا کہ اگر تاثیر کے مشوروں پر عمل کر لیا جاتا تو کشمیر کا قضیہ پیدا نہ ہوتا۔

(سالک "چٹان" ۱۱ دسمبر ۱۹۵۰ء)

اسی لئے ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر کی موت پر اسد ملتانی مرحوم نے اُن کا ماتم یوں کیا:-

"محل کی سازش" میں نہایت ہی کامیابی سے استعمال کیا۔

انہی دنوں جموں وکشمیر فورسز کا ہیڈ کوارٹر سری نگر میں منتقل ہو چکا تھا۔ ہندو سکھ سنگھی تمام ریاست میں پھیل چکے تھے۔ اور ریاست کے گرد و نواح کے سب علاقے فسادات کی خونی لپیٹ میں آ رہے تھے۔ یہ حالات تھے جب مہاراجہ جموں وکشمیر نے شیخ محمد عبداللہ کو رہا کیا

اب شیخ محمد عبداللہ کے لئے دو راستے تھے۔

(اول) گپکار محل (ڈوگرہ مہاراجہ کا قصر)

(دوئم) مجاہد منزل (نیشنل کانفرنس کا ہیڈ کوارٹر)

لیکن شیخ محمد عبداللہ نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور سب سے پہلے اپنی جماعت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو اکٹھا کیا۔ موصوف نے اپنی اولین تقریر میں بدلے ہوئے حالات کا یوں تذکرہ کیا ——

"ہندوستان آزاد ہو گیا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی اسلامی سلطنت معرض وجود میں آئی ہے۔ ہم ایک غلامی سے نکل کر دوسری غلامی میں گرفتار ہونا نہیں چاہتے۔ جموں وکشمیر ہمارا ہے اور ریاست کے الحاق کے بارے میں ہمیں اپنے عوام سے پوچھنا ہے۔ سر دست ہم کو کسی بھی ملک سے کوئی دلچسپی نہیں۔

شیخ عبداللہ (۳۰ ردسمبر ۴۷ء)

اس تقریر سے کانگرس کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں، اور انہوں نے شیخ محمد عبداللہ سے بالا ہی بالا دوسری خفیہ تدابیر اختیار کرنی شروع کیں اسی

زمانہ میں پونچھ کے مجاہدین نے آزادیٔ وطن کا پرچم بلند کر کے بغاوت کر دی تو شیخ محمد عبداللہ نے کہا :-

"پونچھ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ سب مہاراجہ کشمیر کے تعدی و ظلم کا ردِ عمل ہے۔ آج عوام نے مہاراجہ کے خلاف جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ وہاں کے عوام کا پیدائشی حق ہے اور کوئی بھی اس حق کو سلب نہیں کر سکتا۔ مہاراجہ کی فوجیں اس جذبۂ حریت کو پامال نہیں کر سکتیں"۔

("نیا دور" دہلی۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

اور پھر مزید کہا ــــــ

"ریاست کشمیر نے اپنی فوج بھیجی اور پونچھ کے لوگوں میں اضطراب پھیل گیا۔ لیکن پونچھ کے جوان و پیر بیشتر ہندوستانی فوج کے سابق سپاہی تھے جو جہلم اور راولپنڈی کے لوگوں کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو نکال کر پاکستان بھیج دیا اور خود ہتھیاروں سے جو ان لوگوں نے بخوشی ان کے لئے مہیا کئے تھے مسلح ہو کر واپس آ گئے اس وقت حالت یہ ہے کہ ریاست کشمیر کی فوجیں بعض علاقوں میں پسپا ہونے پر مجبور ہو گئیں ہیں۔

(شیر کشمیر ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

"کشمیر کو گرفتار کر لو"
اور
کشمیر پر یلغار کر دو

ظاہر ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے مجاہدین پونچھ کے جہادِ حریت کو نہ صرف پسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ مہاراجہ کشمیر کے ناروا

سلوک کو بھی ہدفِ تنقید بنایا۔ انہی دنوں شیخ محمد عبداللہ کے ایما پر نیشنل کانفرنس کے لیڈر پنجاب مسلم لیگ کے لیڈروں سے گفتگو کرنے کے لئے لاہور پہنچ گئے تاکہ کشمیر کے حالات کی حقیقت بیان کر کے ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کر لیں جو دونوں قوموں کے لئے باعث تعاون اور اتفاق ہو۔ مگر پنجاب مسلم لیگ اور پنجاب پریس نے ان لیڈروں کی مساعی کو "مشکوک" نگاہوں سے دیکھا، اور کشمیری لیڈروں کے خیالات و جذبات کو نہ صرف درخورِ اعتنا نہ جانا بلکہ روزنامہ "زمیندار" نے یہاں تک لکھ دیا، کہ "کشمیر کو گرفتار کر لو"۔ "کشمیر پر یلغار کر دو"۔

جب اس صورت حال کا علم شیخ محمد عبداللہ کو ہوا تو انہوں نے سرینگر سے خواجہ غلام محمد صادق (جو شیخ محمد عبداللہ کی ترجمانی کر رہے تھے۔) کی معاونت کے لئے مسٹر عبدالمجید قرشی ایڈیٹر "جمہور" کو لاہور بھیجا، (کیونکہ مسٹر عبدالمجید قرشی کے تعلقات پنجاب مسلم لیگ کے چند متقدر قائدین اور پنجاب کے با اثر صحافیوں حضرت مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک سے بڑے برادرانہ اور نیاز مندانہ تھے۔) تاکہ پنجاب کے پریس کے جذباتی اور ہنگامی اداریے صورت حال کو بگاڑ نہ دیں، مگر مسٹر عبدالمجید قرشی کے لاہور پہنچنے سے قبل ہی "حالات بگڑ چکے تھے" اور "زمیندار" کے مشورہ کو "قبول" کرتے ہوئے "کشمیر پر یلغار ہو چکی تھی۔ اس سارے حسرتناک اجمال کی تفصیل قرشی صاحب نے یوں بیان کی ہے، جس کا یہاں درج کرنا بہت ضروری ہے۔

"۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو میرا کرنل سرینگر میں مولوی محمد سعید مسعودی کا یہ پیغام ملا کہ شیخ محمد عبداللہ کا یہ حکم ہے کہ میں فوراً لاہور روانہ ہو

جاؤں اور اس گفتگو میں حصہ لوں جو لاہور میں جی۔ایم۔صادق اور مسلم لیگی حکومت میں ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی شیخ صاحب کی یہ ہدایت بھی مجھے بتلائی گئی۔ کہ اس گفتگو کو کسی قیمت پر بھی ٹوٹنے نہ دیا جائے۔"

آگے چل کر قریشی صاحب لکھتے ہیں۔

"میں ۱۹ اکتوبر کی صبح کو سرینگر سے روانہ ہو کر اسی شام کو راولپنڈی پہنچ گیا اور رات کو ریل پر سوار ہو کر ۲۵ اکتوبر کی صبح کو سیالکوٹ پہنچا۔ ارادہ یہ تھا۔ کہ ایک دو دن میں بچوں کا ٹھکانہ بنا کر لاہور جاؤں گا۔ لیکن ابھی وزیر آباد کے سٹیشن پر تھا۔ کہ مجھے پتہ چلا کہ جموں کے لوگوں کا قتل عام شروع ہے اور جموں شہر کے مسلمان گھیرے میں لے لئے گئے ہیں۔ سیالکوٹ پہنچا تو حالات کو اور زیادہ خطرناک پایا۔ جموں علاقہ کے مسلمان بے خانماں لٹے پٹے بہت زیادہ تعداد میں سیالکوٹ پہنچ رہے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ جموں کے علاقے سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے۔ ان کے گھروں کو تباہ کر دیا گیا ہے مستورات کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں اور جو مسلمان سامنے آتا ہے، سکھ اور ڈوگرے اس کو ذبح کر دیتے ہیں۔"

"۲۱ اکتوبر کا دن جموں کے حالات کا جائزہ لینے میں گزر گیا۔ ۲۲ اکتوبر کو جب میں لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا تو یہ خبر آئی کہ قبائلی لشکر کشمیریوں کی امداد کے لئے مظفر آباد پہنچ گیا ہے۔ میں ۲۲ اکتوبر کو لاہور پہنچ گیا۔ لیکن میرے پہنچنے سے ایک گھنٹہ قبل قبائلیوں کے داخلے کی خبر سن کر وہ (خواجہ غلام محمد صادق وغیرہ) ہوائی جہاز میں دہلی جا چکے تھے۔" (آزاد کشمیر ۴ر نومبر ۱۹۵۹ء)

قائد اعظمؒ کو اس سے پیشتر ہی علم ہو چکا تھا کہ ہم کشمیر کے بارے میں سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اپنے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر خورشید حسن خورشید کو سری نگر جانے کا حکم دیا تھا تاکہ بگڑے ہوئے حالات سنبھل سکیں،

بہت ممکن ہے کہ میرا یہ قیاس درست نہ ہو۔ اور ان ایام میں سرینگر میں مسٹر خورشید حسن خورشید کی آمد کسی اور سلسلہ میں ہو۔ مگر واقعات اس بات کے گواہ ہیں کہ سرینگر میں ان کی آمد اور قیام کے دوران حکومت نے نہ صرف اُن پہ کڑی نگرانی رکھی بلکہ بعد میں انہیں گرفتار کر کے جیل میں مقید کر دیا۔ اس بات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ سرینگر میں مسٹر خورشید حسن خورشید کی آمد سے حکومتِ کشمیر نہ صرف خائف اور برہم تھی، بلکہ وہ ان کی سرگرمیوں کو اپنے لئے بے حد مضر سمجھتی تھی۔ بہر حال حکومت کشمیر نے ان کو قلعہ رام نگر میں بند کر دیا۔ اور قائد اعظمؒ کو صحیح صورت حالات کا پتہ نہ چل سکا اور جب مسٹر خورشید حسن خورشید رہا ہو کر پاکستان پہنچے تو اس وقت ان کا قائد اپنے دل میں کشمیریوں کی آزادی کی حسرت اور داغ لئے دور۔ بہت دُور نیلگوں آسمان کی بے پایاں وسعت میں گم ہو چکا تھا۔ اور اس کا خورشید صاحب کو اتنا رنج ہوا کہ انہوں نے اپنے اخبار "گارڈین" میں جو "کشمیر کی کہانی" لکھی اس میں مسلم کانفرنس ہی کو مجرم قرار دیا۔ اور اُن کا ایسا لکھنا ردِ عمل تھا۔ اُن دروغ گوئیوں کے خلاف جو "مسلم کانفرنس" والوں نے کشمیر کے بارے میں پھیلائیں۔ جس کی وجہ سے "کشمیر" بھارت کی آغوش میں چلا گیا۔

لیکن جب خورشید حسن خورشید صاحب سرینگر پہنچے تو کشمیر کی ڈوگرہ حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا اور اس طرح قائد اعظمؒ کی مساعی ناکام

ہو گئیں۔ اس سے اُن کو اتنا دکھ ہوا کہ بقول ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش مرحوم۔

"کشمیر کے مسئلہ کا دکھ ہی اُن کی موت کا پیش خیمہ بنا" اور اُسے وہ آخری وقت تک یاد کرتے رہے۔" (قائدِ اعظم کے ساتھ آخری لمحات)

غرضیکہ ڈوگرہ ہندو حکومت نے صوبہ جموں کے مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔

o۔ مسلم لیگ کی کشمیر پالیسی کے باعث شیخ محمد عبداللہ کو اپنایا نہ جا سکا۔

o۔ مسلم کانفرنس کی قیادت اور اس کے قائم مقام "سطحی قسم کی نعرہ بازی" سے آگے نہ بڑھ سکے اور حالات کو بگاڑنے کے موجب بنے ——؟

o۔ وادی کشمیر کے مسلمان خود کو آگ اور خون کی چکی کے دو پاٹوں میں گھرا ہوا محسوس کرنے لگے۔

ان حالات میں شیخ محمد عبداللہ کے سامنے "اپنی مدد آپ کرو" کا زریں اصول چمکا اور انہوں نے سرینگر میں یہ نعرہ بلند کر دیا۔

"یہ ملک ہمارا ہے"۔ "اس کی حفاظت ہم کریں گے"۔

"اس کی حکومت ہم کریں گے"۔

اور نیشنل کانفرنس کے ہزاروں رضاکاروں پر مشتمل ایک ملیشیا فوج بنا ڈالی۔

o۔ آزاد کشمیر انڈر گراؤنڈ تحریک کے لیڈروں سے رابطہ قائم کر کے مقبول شیروانی کو مجاہدین کی رہنمائی کے لئے سرینگر سے روانہ کیا۔ مگر راستے میں مقبول شیروانی ایک ناخوشگوار حادثہ کا شکار ہو کر اپنی جان کھو بیٹھے۔

اب ریاست کی حالت یہ تھی ——

o۔ آزاد کشمیر کے علاقے میں مجاہدین اور ڈوگروں کی جنگ!

ہ۔ صوبہ جموں میں فسادات اور مسلمانوں کا قتلِ عام!

ہ۔ وادیٔ کشمیر کو پاکستان سے ملانے والے تمام راستے بند!

ہ۔ وادیٔ کشمیر میں نہتے مسلمان۔!

ہ۔ مہاراجہ کشمیر اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سازش سے کشمیر میں ہندوستانی افواج کی یورش۔۔۔۔!!!

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اُس وقت ریاست کا وزیر اعظم مہر چند مہاجن تھا۔ اور شیخ محمد عبداللہ کی حیثیت محض ایک مقامی قومی لیڈر سے زیادہ نہ تھی۔ مگر پھر بھی انہوں نے جرأت سے کام لے کر سرینگر میں سنگھیوں کی خانہ تلاشی کرا کے تمام اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور وہی اسلحہ نیشنل کانفرنس کے کارکنوں میں تقسیم ہوا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ وادیٔ کشمیر کی حالت جموں کی سی نہ ہو سکی۔ اور شیخ محمد عبداللہ کی بروقت کوشش اور محافظت سے کشمیر کے مسلمان آگ اور تشدد کی لپیٹ میں آنے سے بچ گئے۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مسلم کانفرنس کے لیڈروں

مقامِ فکر

نے اس دور میں کیا کیا؟ اور مسلم لیگ یا مسلم لیگ حکومت سے کشمیر کے بارے میں ایسی لغزشیں کیوں ہوئیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ:۔

مسلم کانفرنس کے لیڈر، ایک غیر منظم تحریک "ڈائرکٹ ایکشن" شروع کر کے قوم کو سخت مشکل میں ڈال گئے تھے، حالانکہ اس تحریک کو جاری کرنے کی حضرت قائدِ اعظمؒ نے بھی اجازت نہ دی تھی اور مسلم کانفرنس کے ایک ممتاز لیڈر نے جنہیں مسلم کانفرنس کا "دماغ" بھی کہا جاتا رہا ہے نے بھی اسکی مخالفت کی۔ مگر چودھری

غلام عباس نے ان کا بھی مشورہ قبول نہیں کیا۔ یہاں پر میری مراد مسٹر اے۔ آر ساغر سے ہے۔ جنہوں نے ایک بار عند الملاقات راقم التحریر کو یہ بتایا تھا۔ کہ "مسلم کانفرنس کی ڈائرکٹ ایکشن کی تحریک سے مجھے سخت اختلاف تھا" مگر اس وقت چودھری غلام عباس پر شیخ محمد عبداللہ کو "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کی نقل کا بھوت ایسا سوار ہو چکا تھا۔ کہ انہوں نے صحیح واقعات کا اندازہ تک نہ لگایا اور جیل تشریف لے گئے۔ اور جیل جانے کے بعد بھی اپنی جماعت کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنے کے موجب بنے۔ اور ہر گروہ کو الیکشن کے دوران علیحدہ علیحدہ اپنی سرپرستی کا نہ صرف یقین دلایا۔ بلکہ اس بارے میں خطوط تک تحریر کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جموں اور کشمیر دونوں صوبوں میں مسلم کانفرنس دو حصوں میں تقسیم ہو کر آپس میں کھلم کھلا لڑنے لگی۔ جس کی ایک مثال چودھری حمید اللہ خاں مرحوم اور شیخ محمد امین ٹھیکیدار کا الیکشن ہے یہ دونوں خود کو مسلم کانفرنس کا امیدوار کہتے تھے اور دونوں چودھری غلام عباس کے خطوط کی تشہیر اور نمائش کر رہے تھے۔ اس سے جموں کے مسلمان دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے اور جماعت کی تنظیم آگے نہ بڑھ سکی۔ اور اس کے لیڈروں نے حقیقی مقصد کھو کر اپنی ساری سرگرمیاں مسلم لیگ کے لیڈروں کو غلط قسم کی اطلاعات دینے پر نہ صرف مرکوز کر دیں بلکہ جموں شہر چھوڑ کر پاکستان آگئے۔ یہاں آکر ان مسلم کانفرنسی لیڈروں نے مسلم لیگ کے زعماء کرام کو یہ بتایا کہ صوبہ جموں کے مسلمان ہمارے ساتھ ہیں۔ اور صوبہ کشمیر کے مسلمان میر واعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ کے زیر اثر ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مذہبی عقائد کی وجہ سے کشمیری عوام کو فطرتاً اسلامی تحریک پاکستان سے والہانہ وابستگی تھی اور وہ

اس تحریک تک پہنچنے کا راستہ اپنے محبوب لیڈر شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ہی جانتے تھے۔ جن کے قول و عمل میں حقیقی اسلامی رُوح کارفرما تھی۔ مگر مسلم کانفرنس کے لیڈر اس اہم نکتہ کو دیدہ و دانستہ بھول گئے اور وادیٔ کشمیر میں سیاسی کام اور صوبہ جموں میں تنظیمی کام کرنے کی بجائے "حسنِ بیان" پر زور دیتے رہے اور اُن ادھوری اور ہنگامی داستانوں میں کھو کر اپنی ہردلعزیزی کی وہ کہانیاں لانے لگے جو سرینگر میں ۱۹۴۵ء میں کانگرسی لیڈروں کی آمد پر مخالفانہ مظاہروں کے سلسلے میں مشہور تھی۔ انہوں نے کانگرسی لیڈروں کے خلاف "کشمیریوں کے اُن مظاہروں" کو اپنی مقبولیت سمجھا تھا۔ حالانکہ اس مظاہرہ کا پس منظر تاریخی شواہد کی روشنی میں یوں ہے

مظاہرہ کی کہانی

قبل اس کے کہ اس مظاہرے کی ساری حقیقت بیان کی جائے، یہ ضروری ہے کہ پہلے کشمیر کے حالات کے بارے میں خود آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے بیان کر دی جائے۔

"مصنف تاریخ مسلم لیگ" لکھتے ہیں۔

"کشمیر ایک ہندو ریاست ہے اور وہاں مسلمان ایک عرصہ دراز سے تختۂ ستم بنے ہوئے ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کے سرغنہ اور وہاں کی نیشنلسٹ تحریک کے روح رواں شیخ عبداللہ صاحب ہیں جو شیرِ کشمیر کہے جاتے ہیں اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تمام مسلمان ان کے ساتھ ہیں"۔

آگے چل کر وہ کانگرسی لیڈروں کے خلاف مظاہرہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:۔

"شملہ کانفرنس سے فارغ ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد۔ خان عبدالغفار خان اور پنڈت جواہرلعل نہرو کشمیر تشریف لے جاتے ہیں۔ شیخ عبداللہ نے

ان حضرات کے اعزاز میں اپنی نیشنل کانفرنس کی طرف سے ایک دریائی جلوس نکالا۔ کشمیر کے مسلمان پاکستان کے ان مخالفوں کا استقبال کرنے یا انہیں اعزاز دینے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے مخالفت کی ہنگامہ ہؤا، ایک مسلمان ہلاک، درجنوں زخمی اور پچاس گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں"

(تاریخ مسلم لیگ)

اس مظاہرے کے بارے میں ۱۲ر اگست ۱۹۴۵ء کو کشمیر حکومت نے یہ کمیونک جاری کیا

"مولانا آزاد، خان عبدالغفار خان، پنڈت نہرو کے اعزاز میں ایک دریائی جلوس کل شام کو نیشنل کانفرنس نے نکالا۔ جس کے لئے ضلع مجسٹریٹ سے اجازت لی گئی تھی۔ شہر کے ایک علاقہ میں مسلم کانفرنس کے مقلدین نے جلوس اور نیشنل کانفرنس کے حامیوں پر پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ اس کی وجہ سے دونوں جماعتوں کے بہت سے آدمی زخمی ہوئے اور نیشنل کانفرنس کا ایک حامی ہسپتال میں زخموں کی وجہ سے ہلاک ہو گیا۔ پولیس نے مداخلت کی اور اگرچہ پولیس کے کئی آدمی زخمی، اور ایک مجسٹریٹ زخمی بھی ہؤا۔ مگر حالات پر قابو حاصل کر لیا گیا۔ شہر کے متاثرہ علاقوں میں جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔"

اس وقتی ہنگامے کو مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ تمام وادی میں چھا گئے ہیں اور اب مزید کسی تنظیم کی ضرورت نہیں حالانکہ اس مظاہرے کے بارے میں عبدالغفار خاں کے سوانح نگار کا یہ خیال ہے کہ:۔

نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد گذشتہ سولہ برسوں میں شیخ محمد عبداللہ کی مسلسل جدوجہد نے کشمیر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اس کانفرنس میں پنڈت جانہرو بھی شریک ہوئے۔

باہر سے آئے ہوئے تمام مہمانوں کا دریائی جلوس نکالا گیا، لیکن ڈوگرہ حکومت نے اپنے زر خرید ایجنٹوں کے ذریعے اس کے خلاف شدید مظاہرہ کرائے اور مظاہرین نے اس جلوس پر سنگ باری بھی کی،

اس سنگ باری پر باچا خان عبدالغفار خاں نے ناراض ہونے کی بجائے خوشی کا اظہار کیا اور کہا شکر ہے کہ کشمیریوں جیسی مردہ قوم میں اتنی جرأت تو پیدا ہوئی کہ وہ پتھر برسانے کے قابل ہوئے۔ ورنہ یہاں سیاسی تحریکوں سے پہلے تو بیرونی لوگوں کی صورت دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ اس سنگ باری سے پنڈت نہرو اور شیخ محمد عبداللہ کو کچھ زخم بھی آئے اور پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں ڈوگرہ حکومت کی اس ذلیل اور گھٹیا حرکت کی مذمت کرتے ہوئے کہا۔

"کشمیری بھائیو! شیخ عبداللہ نے تمہیں زندگی دی ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسا لیڈر دیا جو تمہارے لئے دنیا کی ہر طاقت سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔ ڈوگرہ حکومت نے جانوروں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس کی کوششوں سے تم آج پھر انسانوں کے روپ میں نظر آرہے ہو، لیکن افسوس ہے کہ تم نے اس کی قدر نہ کی، اور حکومت کے ہاتھوں بک کر آج اس شخص کی مخالفت کر رہے ہو جو تمہارا دوست بھی ہے اور محسن بھی۔"

("باچا خان" صفحہ ۲۴۵)

غرضیکہ مسلم کانفرنس کے قائدین واقعات کو جانتے ہوئے بھی "احمقوں کی جنت" میں بسے رہے اور شیخ محمد عبداللہ کی مخالفت میں اتنے آگے نکل گئے کہ قائدِ اعظمؒ کو بھی گمراہ (MISLEAD.) کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے اور بقول حمید نظامی

مرحوم ایڈیٹر نوائے وقت لاہور۔ "قائدِ اعظم نے شیخ محمد عبداللہ اور "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کے خلاف بیان چودھری غلام عباس کے ایما پر دیا تھا۔"

(کشمکش از عباس)

اب سوال یہ ہے کہ

۵۔ اگر مسلم کانفرنس والے خود کو کشمیریوں کے نمایندے جانتے تھے۔ تو پھر کیوں ان کی اپنی تحریک کامیاب نہ ہوئی۔؟

۵۔ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے جیل جانے کے بعد میدان خالی رکھ کر حکومتِ کشمیر کو سازشوں کا موقع کیوں دیا؟

۵۔ اگر ڈائرکٹ ایکشن تحریک درست تھی یا یہ لوگ ریاست جموں وکشمیر میں تحریک پاکستان کے حامی اور ضامن تھے تو مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے اپنا مسلک ترک کرکے "آزاد و خود مختار کشمیر" کا نعرہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں کیوں بلند کیا؟ جب کہ پہلے الحاقِ پاکستان کی یہ قرارداد پاس کرچکے تھے۔

الغرض مسلم کانفرنس والوں نے خود ہی سارے مسئلہ کو مفلوج اور خراب کر دیا۔ بیرون ریاست شیخ محمد عبداللہ اور مسلم لیگ میں اختلافات کی خلیج حائل کردی اور اندرونی طور پر نازک وقت میں اپنا مسلک بدل کر میدان چھوڑ گئے۔ نتیجتاً ریاست

لہ "اگر آزاد جموں وکشمیر پر پاکستان نے بھی حملہ کیا تو میں پہلا آدمی ہوں گا جو تلوار لیکر اس کا مقابلہ کروں گا۔"

(چودھری حمیداللہ خاں قائم مقام صدر آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس۔ پریس کانفرنس میجسٹک ہوٹل سرینگر)

کے اندر اور باہر غیر ملکی افواج منڈلانے لگیں۔ اور بعد ازاں ؎

"چھوٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا"

کا راگ الاپ کر اپنی لغزشوں کو بھولنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

چنانچہ کشمیریوں کی قسمت کا فیصلہ اقوام متحدہ کے سپرد ہو گیا۔ جس نے جنگِ حریت بند کرا دی اور اندرون کشمیر شیخ محمد عبداللہ آگ اور خون کے سنگھم پر کھڑے ہو کر ان اندوہناک حالات کو بدلنے کی تدابیر کرنے لگے۔ کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کر لیا کہ "اپنوں کی بے اعتنائیوں اور سازشوں" لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ اور کشمیری عوام آج بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں، جہاں سے انہوں نے سفر شروع کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو صاف صاف کہہ دیا۔ کہ "ہمیں کشمیر کی آزادی کا فیصلہ اپنے خون سے کرنا ہو گا" اور اب یہی نصب العین موجودہ آزاد حکومت جموں و کشمیر نے قرار دے کر ایک نئے دور کی نیو رکھی ہے، جہاں سے مستقبل بہت قریب ہے۔ انشاء اللہ العزیز۔

یہ ہے مختصر ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی۔ ذہنی اور نفسیاتی فضا جس میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے خیالات اور اعمال نشو و ارتقا پا کر کشمیریوں کے لئے روشنی کا مینار بنے اور بنتے رہیں گے۔ آئندہ ابواب میں شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت و سیاست اور اس کے تاریخی پس منظر کو پیش کر کے ریاست کی تحریک حریت کا جائزہ اس خیال اور نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے کہ کشمیریوں کی آئندہ نسلوں کو یہ پتہ چل سکے کہ ماضی میں وہ کن صدمات سے دوچار ہوتے رہے ہیں تاکہ وہ ان کو پیش نظر رکھ کر شاہراہ زندگی پر اگلے قدم رکھیں جو باعث عزت بھی ہوں اور حریت بھی ؛؛

اپنی کہانی — اپنی زبانی

ذہنی ارتقاء

ذہنی ارتقاء

شیخ محمد عبداللہ کے آباو اجداد راجواڑہ (کشمیر) کے رہنے والے تھے، بعد ازاں وہ سورہ نامی ایک بستی میں جو سرینگر شہر سے قریب ہی ہے، آکر آباد ہو گئے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ برہمن النسل ہیں۔ ان کے پرداوا نے میر عبدالرشید بانہتی کے ہاتھ پر جو اپنے وقت کے بڑے دینی بزرگ اور مذہبی پیشوا تھے۔ ۱۷۶۶ء مطابق ۱۱۸۰ھ میں اسلام قبول کیا تھا۔ اُن کا نام بھی محمد عبداللہ تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کے والد شیخ محمد ابراہیم وادیٔ کشمیر میں پشمینہ کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے، جن میں شیخ محمد عبداللہ سب سے چھوٹے ہیں۔ آپ دسمبر ۱۹۰۵ء میں اپنے والد کی وفات سے چند روز بعد پیدا ہوئے۔ "سورہ" گاؤں ہی آپ کی جائے پیدائش ہے۔ اپنے ابتدائی حالات کے بارے میں خود شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا بیان ہے۔ کہ :-

"میں دسمبر ۱۹۰۵ء میں بمقام سرینگر کشمیر پیدا ہوا۔ میری پیدائش سے ۱۵ روز

قبل میرے والد محترم شیخ محمد ابراہیم مرحوم و مغفور کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد محترم جو اثاثہ چھوڑ کر فوت ہوئے۔ والدہ محترمہ نے اس سے میری پرورش فرمائی اور ان کے پاس جس قدر دنیوی دولت تھی، سب میری تعلیم و تربیت پر نثار کر دی۔ ایسی شفیق، ایسی عقلمند اور ایسی مربی مائیں بہت کم دیکھی جاتی ہیں۔ اگر میں آج اپنے نام کے ساتھ ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری استعمال کر سکتا ہوں تو یہ انہی کی مشفقانہ اور مادرانہ ہمدردی اور ایثار کا نتیجہ ہے"

میرے والد محترم پشمینہ کے تاجر تھے اور تجارت ہمارا آبائی پیشہ ہے ان کے فوت ہونے کے بعد بھی ان کا کاروبار میرے قریبی رشتہ داروں کی زیر نگرانی چلتا رہا۔ اور والدہ محترمہ نے پردہ میں بیٹھ کر کاروبار کا خاص خیال رکھا۔ مجھ سے ایک بڑا بھائی ہے، شیخ محمد مقبول جو سری امر سنگھ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ سرینگر میں ڈرائنگ ماسٹر ہے۔

تعلیم کا شوق

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گو ان کی والدہ محترمہ نے اپنی نگرانی میں کیا، لیکن خود شیخ محمد عبداللہ کے اپنے دل میں بھی علم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اور بقول اُن کے ——

"مجھے بچپن ہی سے تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ میں نے اپنا وقت کبھی فضول باتوں میں ضائع نہیں کیا۔ خداوند تعالیٰ نے شروع ہی سے مجھ کو خودداری کا مادہ ودیعت کیا تھا اور مجھے اس کو برقرار رکھنے کے لئے کبھی کبھی مشکلات و مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑتا"

خودداری۔ شیخ محمد عبداللہ کو ابتدا ہی سے صدمات اور مشکلات سے دوچار

ہونا پڑا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنی خودداری اور عزم سے حالات کا رخ پھیرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور کبھی اپنی خودداری پر آنچ تک نہ آنے دی۔ اس بارے میں وہ خود کہتے ہیں۔

"ابھی میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس[1] کیا ہی تھا کہ والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی وفات سے دنیا سے ایک ایسی ہستی اٹھ گئی جس کے احسانات کے بارے میرے بدن کا رؤاں رؤاں دبا ہوا ہے۔ کاش وہ زندہ رہتیں اور دیکھتیں کہ ان کا خوددار بچہ جس نے اپنی شان خودداری برقرار رکھنے کے لئے کئی بار مصائب و آلام کا مقابلہ کیا، کس طرح اپنے ہموطنوں کی آن اور شان پر قربان ہونے کے لئے جان بکف میدان میں نکل آیا ہے"۔ شفیق مائیں داغ مفارقت دے جاتی ہیں لیکن ان کی محبت اور شفقت کبھی فراموش نہیں ہوتی"۔

شیخ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"دسویں جماعت پاس کرنے اور والدہ محترمہ کے انتقال فرمانے کے بعد میں نے بڑی بڑی مالی مشکلات برداشت کرتے ہوئے تعلیم جاری رکھی، اور سری نگر سے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخل ہو گیا، مجھے بچپن ہی سے اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کی مظلومیت پر افسوس ہوتا تھا۔ اور میرا دل خون ہوا جاتا تھا۔ اور اکثر میری معصوم آنکھیں فرط ہمدردی سے پُرنم ہو جاتیں"۔

---

[1] ۱۹۲۲ء میں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

کشمیری عوام کی بے بسی دیکھ کر شیخ محمد عبداللہ کے دل میں ایک اضطراب نے جنم لے لیا، جو بعد میں ایک ایسے انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا جس نے تمام برِصغیر پاک و ہند کی سیاست کو متاثر کر دیا۔ کشمیریوں کی اذیت پرست زندگی کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے اوائل عمر ہی میں فیصلہ کر لیا تھا، اور اس مقصد کے لئے انہوں نے جان کی بازی لگا دینے کا ارادہ بھی کیا اور جس پر وہ اب تک قائم ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"بچپن کا واقعہ ہے (اور اس وقت میری عمر ۱۴ یا ۱۵ برس کی ہو گی) میں حسبِ معمول سیر کرنے گھر سے نکلا میں امیر یعنی شہر کے باہر چنگی خانہ کے قریب پہنچا تھا کہ میری آنکھوں نے ایک دل تڑپا دینے والا منظر دیکھا۔ میں ہر روز دیہات سے آنے والے غریب کشمیری بھائیوں کو لکڑیاں اٹھائے یا کوئی اور شے لادے شہر آتے دیکھتا تھا۔ ان بے گناہ اور مظلوم انسانوں سے حکومت کے نشہ میں چور ہوئے ہوئے اہل کار جس بے رحمی اور سنگدلی کا سلوک کرتے تھے۔ اور جس طرح وہ انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس سے مجھے ہمیشہ رنج پہنچتا۔ میں بچہ تھا۔ میرے معصوم دل میں بارہا جوش پیدا ہوا کہ میں بے گناہ اور غریب دیہاتی بھائیوں پر ظلم کرنے والے حکام کا ہاتھ پکڑ لوں۔ لیکن ایک معصوم اور کمسن ایک صاحب طاقت حاکم کے سامنے کیا حقیقت رکھتا تھا۔ اور یہ نظارہ اتنا دردناک اور رلا دینے والا تھا۔ کہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اور میں نے اپنے دل کی آگ کے شعلوں میں ظالم کو لپیٹ ہی لیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا دیہاتی بوسیدہ چیتھڑے پہنے سر پر لکڑیوں کا بار اٹھا

چونگی خانہ آیا۔ جوالداہ نے جو شاید لاک سے زیادہ وتیوی دولت کا حریص اور انسانی خون کا پیاسا تھا، اس بوڑھے سے محصول لینے کے بعد بھی اس سے چند لکڑیاں زبردستی چھین لیں۔ اور زائد رقم بھی لے لی۔ اس سے بھی اس کا پیٹ نہ بھرا۔ اور اس کی آنکھیں غریب کے بار کی ایک موٹی سی لکڑی پر پڑیں۔ اور اس بوڑھے اور بے کس دیہاتی سے اس کا مطالبہ کیا۔ لکڑہارے نے ڈرتے ڈرتے اور کانپتے ہوئے جواب دیا۔

" مہاراج یہی لکڑیاں ہیں، جن کو فروخت کر کے میں اپنا اور اپنے بال بچوں اور بیوی کا پیٹ پالوں گا۔ اگر آپ نے دوسری لکڑیوں کی طرح یہ بڑی لکڑی بھی لے لی تو میں بازار میں کیا فروخت کروں گا۔"

پنڈت جی مہاراج نے اس بیکس اور غریب انسان کے نالہ آہ وزاری پر ذرا رحم نہ کھایا۔ اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے ساتھ اُسے لکڑی اٹھا کر مارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ یہ ظالم اس غریب کو بے وجہ اور ناحق مار رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں لپک کر آگے بڑھا اور اس سے گویا ہوُا :۔

" مہاراج آپ اس غریب کو کیوں بے وجہ پیٹتے ہیں۔ وہ بال بچوں والا ہے۔ غریب ہے۔ اگر آپ نے لکڑیاں چھین لیں تو وہ کیسے بال بچوں کا پیٹ پال سکے گا۔"

پنڈت جی کے سر پر حکومت کا جنوں سوار تھا۔ انہوں نے میرے دخل در معقولات پر بُرا منایا۔ اور میری بات کا جواب یوں دیا۔ کہ وہ غریب دیہاتی کو زیادہ سختی سے پیٹنے لگے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے جھٹ آستین چڑھالی۔ اُس نے مجھے مکا

مارا۔ اور میں بھی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے اس کی خبر لینے لگا۔ ہمارا شور سُنکر لوگ اکٹھے ہو گئے اور پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا۔

پہلی گرفتاری

اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ پہلی دفعہ زمانہ طالب علمی میں گرفتار ہوئے تھے۔ اور وہ بھی اس بنا پر کہ انہوں نے ایک ظالم سرکاری کارندے کو ایک محکوم کشمیری مسلمان پر جبر کرنے پر ٹوکا تھا۔ اس پہلی گرفتاری پر بھی انہوں نے صداقت سے کام لیا۔ اور حکومت سے خوفزدہ نہیں ہوئے بقول اُن کے ——

"تھانے پہنچ کر مجھ سے پوچھا گیا کہ تم نے پنڈت جی پر ہاتھ کیوں اٹھایا"

"میں نے پولیس والوں کو تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اور کہا کہ میرا دِل ظالم حوالدار کا ناروا استبداد دیکھ کر تڑپ گیا اور میں خاموش نہ رہ سکا۔ اور اگر اس نے پھر کسی غریب پر یوں ظلم کیا تو میں پھر اس کی خبر لوں گا پولیس نے کچھ دیر بٹھا کر رہا کر دیا۔"

شیخ محمد عبداللہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میں اس واقعہ کے بعد وہاں جاتا رہا اور ہر روز چنگی خانہ کے قریب جا کر کھڑا ہوتا۔ لیکن اب حوالدار کو کچھ سمجھ آ گئی اور وہ کم از کم میرے سامنے غریب دیہاتیوں پر ظلم برپا نہیں کرتا تھا۔"

سرینگر سے ایف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کی فضا نے ان کے ذہن و دل پر بہت

گہرا اثر ڈالا۔ وہ کشمیر کے حالات کا یہاں کے حالات سے موازنہ کرکے صورتِ حال کو بدلنے کے منصوبے تیار کرتے رہتے۔ لاہور میں اسلامیہ کالج میں انہیں بڑے دردمند دل رکھنے والے صاحبِ علم اساتذہ اور لیڈروں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اس درسگاہ کی تربیت نے ان کے ذہن میں طوفان پیدا کر دیا۔ اور خود اُن کے الفاظ ہیں۔

"جب میں نے لاہور کی آزاد فضاؤں میں ہوا کھائی اور میں نے اپنے پنجابی بھائیوں کی زندگی سے اپنے کشمیری بھائیوں کی حالت کا موازنہ کیا تو مجھے شرم کے مارے اپنا سر جھکا لینا پڑا۔ میں نادم تھا کہ کیا ہم کشمیری بھی انسان کہلانے کے مستحق ہیں کیا دنیا کے پردے میں ہم سے زیادہ کوئی غلام ہے؟"

دیارِ غیر میں غم

"ہر سال سرما میں کشمیر سے میرے بہت سے غریب ہموطن لاہور آتے اور وہاں محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے۔ جب میں ان کو مٹی ڈھوتے اور بھاری شہتیر یا وزنی بوریاں اُٹھاتے دیکھتا، تو دل سے بے اختیار آہ نکل جاتی۔ میرا دل ان غریب الوطنوں کی بے کسی مفلسی اور مظلومیت پر آٹھ آٹھ آنسو روتا تھا۔ اور ہر لحظہ دل سے یہ دعا نکلتی تھی کہ اے غریبوں اور بیکسوں کے والی خدا! تو وہ دن لا کہ میں اپنے مظلوم بھائیوں کو خوشی امن اور چین کی زندگی بسر کرتے دیکھوں ان پہ کوئی جابر ہاتھ ظلم بپا کرنے نہ اُٹھے۔ اور یوں بے کسی مظلومی کی حالت میں کشمیر کے قطعۂ بہشت کو چھوڑ کر پنجاب کے میدانوں میں جھیلنے نہ آئیں۔

—— اور طعنے! — میں کشمیری تھا۔ اور میرے ہم وطن بھائی پنجاب میں گدھوں سے

زیادہ محنت کر کے پیٹ پالتے تھے۔ ان کی وجہ سے میرے ہم جماعت دوست مجھ پر آوازے کستے مجھ پر طعن زنی کرتے اور مجھے ہنسی کے طور پر "ہتو" کہہ کر پکارتے۔ میں بے اختیار تھا۔ میں سوائے اپنے ہموطنوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو بہانے کے اور کیا کر سکتا تھا۔ میرے پنجابی دوستوں کا مذاق مجھ پر بجلیاں گراتا تھا۔ مجھے اپنے وطن عزیز سے زیادہ محبت ہوگئی۔ میں مظلوم تھا اور مظلوم قوم کا فرد تھا۔ ایک مظلوم کے لئے اس کا وطن ہی بہترین جائے پناہ ہے"۔

لاہور کے قیام کے دوران میں ایک اور دل تڑپا دینے والا واقعہ شیخ محمد عبداللہ کو پیش آیا۔ اس کے راوی خواجہ عبدالرحیم ڈار ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے یہ واقعہ خود بتایا تھا۔ جب وہ لاہور میں مقیم تھے تو وہ دیگر کشمیری طالب علموں کے ساتھ شام کو شہر سے دور سیر کرنے کے لئے نکل جاتے تو ایک شام انہوں نے دیکھا کہ ریل کے پل کے اس پار میدان میں لکڑیوں کے ٹال کے قریب ایک لاش پڑی ہے۔ جب وہ اور قریب گئے تو دیکھا کہ ایک کشمیری مزدور بیماری کے باعث دم توڑ چکا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے خود اس لاش کو اٹھایا۔ اور اُسے ایک مسجد میں جا کر غسل دیا۔ اس کے کفن کا بندوبست کر کے رات کو اُسے دفن کر دیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے جن میں ڈاکٹر غلام رسول بھی شامل تھے کہا کہ جب تک ہم اپنی حفاظت خود نہ کریں گے۔ اُس وقت تک ہماری مظلومی کی داستان ختم نہیں ہو گی۔ اس عہد کا ذکر خود شیخ محمد عبداللہ نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس[1] کر کے علی گڑھ چلا گیا

---

[1] ۱۹۲۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔

اور وہاں ایم۔ ایس۔ سی جماعت میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی میری حالت ایسی تھی میرے لئے کشمیری ہونا ایک عیب تھا۔ جو نہ لاہور میں معاف کیا گیا اور نہ علی گڑھ میں"۔

"وطن اور وطن سے باہر اپنے عزیز وطن اور اہلِ وطن کی یہ ذلّت و رسوائی دیکھ کر میرا دل پاش پاش ہو گیا اور میں نے بے زبان کشمیریوں کے استخلاص کے لئے دعا کی اور سچے دل سے یہ حلف اٹھایا کہ میں یا تو اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کو ان مصائب سے نجات دلا دوں گا یا خود بھی صیّاد کے ظلم و ستم کا شکار ہو جاؤں گا"۔

میرا مسلک اپنے مسلک اور مقصدِ حیات کے بارے میں شیخ محمد عبداللہ فرماتے ہیں:۔

"میری ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ اپنے وطن عزیز کو تمام دنیا میں سربلند دیکھوں۔ میں فرقہ پرستی کو قوم و ملک کے لئے لعنت سمجھتا ہوں اور میں کبھی بھی فرقہ پرستی کا جرم معاف نہیں کر سکتا اور نہ پہلے کبھی کیا ہے۔ کہ ایک قوم یا ایک جماعت دوسری قوم یا جماعت پر ظلم برپا کرے۔ اس سے ناانصافی کرے اور اس کے حقوق پامال کرے۔ میں قومیت متحدہ کا حامی ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف کا طلب گار بھی ہوں۔ میرا مسلک انصاف ہے اور میں ہمیشہ سے حق بحقدار رسید کی ضرب المثل پر کاربند ہوں"۔

لاہور اور علی گڑھ کے قیام کے دنوں میں شیخ محمد عبداللہ نے ہندوستان کے مشہور مسلمان لیڈروں سے ملاقاتیں کیں اور خصوصاً ان لوگوں سے کشمیریوں کا قضیہ درد چھیڑا جو کشمیریوں کی مظلومیت کو ختم کرنے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ جن میں علامہ اقبال مرحوم اور کشمیر کمیٹی کے اراکین بھی تھے۔ اور علامہ اقبال تو بار بار کہہ

رہے تھے ——"

"ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دار و گیر"

غرضیکہ شیخ محمد عبداللہ کی حق گوئی، جرأت، اور ذہانت سے علامہ اقبال بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ نوجوان اپنی جد و جہد سے کشمیریوں کی قسمت کو بدل دے گا۔ علامہ کی کوشش سے شیخ محمد عبداللہ کو کشمیر کمیٹی سے وظیفہ ملا۔ اور وہ مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے ——!! چنانچہ لکھتے ہیں۔

"میں ابھی علی گڑھ میں تھا کہ اخبارات میں کشمیر کے سابق وزیر سر ایلبین بینرجی کا بیان چھپا۔ اس بیان کی اشاعت کے بعد مسلسل مضامین چھپنے شروع ہو گئے اور کشمیر کا معاملہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑے کی بنا بن گیا۔ ہندو اخبارات نے سر بینرجی کے سراپا صداقت بیان کو جھٹلانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ مسلمانوں نے جی کھول کر کشمیریوں کی حالت واشگاف بیان کی۔ یہ مخالفت اور موافق مضامین میری دلچسپی کی آماجگاہ بن گئے۔ ان کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر حکومت کشمیر اور مدعیان انصاف کے سامنے مسلمانوں کے اصلی حالات پہنچ جائیں تو شاید اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکے۔"

سر ایلبین بینرجی

سر ایلبین بینرجی جن کے بیان سے کشمیر کے حالات دنیا کے سامنے عیاں ہوئے، مہاراجہ کشمیر کی کونسل کے سینئر ممبر تھے۔ یہ کونسل مہاراجہ پرتاب سنگھ کے بعد معرض وجود میں آئی تھی اور بقول اکبر

تمنت ایوانِ جلالت کی نہ کچھ پوچھو اکبر
راجہ اُٹھنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ بیٹھی کونسل،

سر البین بنرجی ۱۹۲۷ء سے ایک سنہ ۱۹۲۹ء تک کشمیر کی کونسل کے ممبر رہے کشمیر کی حکومت سے علیحدہ ہونیکے بعد لاہور پہنچ کر ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو جو بیان انہوں نے دیا اس کا مفہوم اس طرح تھا۔

"ریاست جموں وکشمیر کے راجہ اور پرجا کے مابین کوئی تعلق نہیں ہے ریاست کے عوام ڈھور ڈنگر کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی جو ۔۹ فیصدی ہیں، ریاست کے اندر بہت بُری حالت ہے اُن سے اچھوتوں کا سا سلوک روا رکھا جا رہا ہے تعلیمی پستی میں ان کی مثال نہیں۔ حکومت کے تمام اداروں پر ہندو چھائے ہوئے ہیں۔ آزادی رائے کا نام تک موجود نہیں مسلمان حکمران طبقہ کے رحم وکرم پر ہیں"——

سر البین بنرجی کے اس بیان سے ہندوستان کا "اینگلو انڈین" پریس۔ اور مسلم اخبارات میں تلاطم سا برپا ہو گیا اور کشمیر موضوع بحث بن گیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور اس کی حکومت نے اس بیان کی تردید میں بہت کچھ کہا لیکن وہ آواز جو ایک ذمہ دار شخصیت کی طرف سے بلند ہو چکی تھی جھٹلائی نہ جا سکی۔ اور لاہور کے اخبارات ایسٹرن ٹائمز، انقلاب، سیاست۔ زمیندار اور مسلم آوٹ لک وغیرہ نے بڑے سخت مقالات لکھے کشمیر کے کچھ لوگوں نے بھی اپنے حقوق کے حصول کیلئے آوازیں بلند کرنی شروع کر دیں جن میں جموں شہر کے نوجوانوں کی ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن[1] پیش پیش تھی۔ انہی دنوں ۱۹۲۶ء میں معززین کشمیر کی ایک جماعت نے جن میں خواجہ سعید الدین شال

---

[1] انجمن نوجوانان کشمیر کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں مولانا غلام احمد ہمدانی کی تحریک پر سرینگر میں رکھی گئی۔ اور جموں میں اس قسم کی ایک اور انجمن "ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن"

مولانا غلام احمد ہمدانی اور خواجہ نور شاہ قابلِ ذکر ہیں، ایک طویل میمورنڈم ڈوگرہ حکومت کے مظالم کے خلاف، وائسرائے ہند کے پاس ارسال کیا، جس میں کشمیری عوام کی خستہ حالی حقوق کی حق تلفی اور آزادی پر ناروا پابندیوں کا ذکر تھا۔ جب مہاراجہ کشمیر کو اس بات کا علم ہُوا تو اس نے ان اشخاص کو سختی سے منع کیا اور ان کی نگرانی کی جانے لگی۔ اور بعد ازاں اُن کی جائیدادیں بھی ضبط کر لی گئیں۔

علی گڑھ سے واپسی

شیخ محمد عبداللہ علی گڑھ سے واپسی کے بارے لکھتے ہیں:-

"میں علی گڑھ سے ایم۔ ایس سی[1] کی ڈگری لینے کے بعد سرینگر چلا آیا۔ اس وقت خوش قسمتی سے مجھے دس بارہ تعلیم یافتہ مسلمان آن ملے جو تازہ تازہ سرینگر وارد ہوئے تھے۔ مقامی ہندو حکومت نے دیکھا کہ مسلمان سخت ترین مشکلات کے باوجود تعلیم میں ترقی حاصل کرتے جا رہے ہیں، اس لئے اس نے محسوس کیا۔ کہ اب اس کی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷۹) کی بنیاد بھی ڈالی گئی، جس کی حیثیت پہلے علمی و ادبی تھی۔ بعد ازاں "تحریک حریت کشمیر" اسی کی آغوش میں پروان چڑھتی رہی، اور انہی انجمنوں کے سیاسی شعور رکھنے والے نوجوان ریاست جموں و کشمیر میں مختلف الخیال مکتبۂ فکر کے خالق بنے ان انجمنوں کے کارکنوں کی کوششوں ہی سے ۱۹۱۶ء میں حکومت ہند کے مشیر تعلیم مسٹر شارپ نے کشمیر کا دورہ کیا اور عوامی فلاح و بہبود کے لئے چند سفارشات پیش کیں۔ جن پر مہاراجہ کشمیر نے بہت طویل مدت تک عمل درآمد نہیں کیا تھا جس کے باعث مسلمانوں کے اندر ہی اندر غم و غصہ کی لہر دوڑتی رہی۔

[1] ۱۹۳۰ء میں ایم۔ ایس۔ سی کیمسٹری کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔

خبر اس میں ہے کہ کسی طرح ان تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مزید قیود عاید کر کے انہیں
حکومت میں کسی قسم کا بھی حصّہ نہ لینے دیا جائے۔ اس لئے اس مقصد کو لیکر
سول سروس ریکروٹنگ بورڈ کا ڈھونگ رچایا۔ نوجوان مسلمانوں نے
میری سرکردگی میں اس بورڈ کی مخالفت میں ایک عرضداشت کابینۂ
وزارت میں پیش کی۔ ایک وفد بھی جس میں میرے محترم دوست عبدالعزیز
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تھے، کابینۂ وزارت سے ملا اور اس پر
ریکروٹنگ بورڈ کے نقائص بالتفصیل واضح کئے، لیکن وفد کو قابل
وزراء نے جو جواب دیا۔ وہ حد درجہ حوصلہ شکن تھا۔ بس یہیں سے تعلیم یافتہ
مسلمانوں میں خصوصًا اور عام مسلمانوں میں عمومًا بے چینی پیدا ہو گئی اور
مسلمان حکومت کی جانبدارانہ حکمتِ عملی پر خفیہ اور اعلانیہ حملے
کرنے لگے، اور مسلم نوجوانوں نے اپنے مقصد کی اشاعت کے لئے پنجاب کے
اسلامی اخبارات سے استمداد کی۔ جب حکومت نے دیکھا کہ اُس کی
تمام کاوش طشت از بام اور دنیا پر مظلومین کشمیر کی حقیقی حالت روشن
ہوتی جاتی ہے۔ تو اس نے اخبارات کا داخلہ بند کرنے کا حربہ استعمال
کیا۔ "سیاست" کا داخلہ پہلے ہی حدود ریاست میں ممنوع قرار
دیا گیا تھا۔ اب "انقلاب" اور "مسلم آوٹ لک" پر عتاب کی بجلیاں
گرانے کے مشورے ہونے لگے۔ اور جلد ہی اُن کا گلا گھونٹ دیا
گیا۔ اخبارات کی بندش سے حکومت نے مسلمانوں کو مفلوج کر دیا۔
اخبارات کا داخلہ بند کرنے کے ساتھ جب حکومت نے بعض غیر ریاستی

ہمدردانِ کشمیر کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا تو مسلمان بے قرار ہو گئے ہم نوجوانوں نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور حکومت کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ہماری ہر کوشش بے سود اور ہر آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی ——— !!!

سرکاری نوکری "ادھر یہ سلسلہ جاری تھا۔ کہ میں گورنمنٹ ہائی سکول سرینگر میں ملازم ہو گیا۔ میں ایم۔ایس۔سی تھا۔ لیکن حکومت نے مجھے ۶۰ روپے ماہوار تنخواہ اور (۲۲) بائیس روپے الاؤنس کی ملازمت دی۔ حالانکہ مجھ سے کم تعلیم یافتہ یا بالفاظ صحیح نیم تعلیم یافتہ ہندو بڑے بڑے عہدوں بلکہ وزارتوں پر قابض تھے۔ حکومت کی یہ روش بتا رہی تھی کہ وہ مسلمانوں کو انتظامِ ملک میں شریک کرنا نہیں چاہتی۔ لیکن یہ ان ہونی بات ہے جب تمام ہندوستانی شریک حکومت ہونے کے باوجود انگریزوں سے مطالبہ حقوق پر اڑے ہوئے ہیں کشمیری اپنی غلامی پر کیسے فارغ رہ سکتے ہیں۔ بیرونی تحریک آزادی کا کشمیر کے باشندوں پر اثر انداز ہونا یقینی امر ہے۔ حکومت لاکھ کوشش کرکے اُسے مسلمانوں کو جو کشمیر کی آبادی کا ۹۵ فیصدی ہیں، اپنا ساجھی بنانا پڑے گا۔"

اور قومی خدمات ——— حکومتِ کشمیر کا ملازم ہونے کے باوجود شیخ محمد عبداللہ نے سیاسیات میں کھلم کھلا حصّہ لینا شروع کر دیا اور ان جماعتوں سے، جو پہلے حکومت کے عتاب سے ڈر کر پوشیدہ کام کر رہی تھیں، رابطہ قائم کر لیا اور ان اصلاحی انجمنوں کو مکمل سیاسی جماعت کی شکل دینے کی ٹھانی۔ اس غرض کے لئے وہ جموں گئے۔ جہاں ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے

کارندے بڑی جانفشانی اور ہمت سے تحریک کشمیر کا کام کر رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے ان سے مِل کر سری نگر میں ایسوسی ایشن قائم کرنے کی درخواست کی اور بقول چودھری غلام عباس :۔

"شیخ محمد عبداللہ نے سری نگر پہنچتے ہی ایسوسی ایشن کی طرح ڈالی اور بحثیت ملازم انہوں نے جلسوں اور جلوسوں اور تقریروں کا ایک سلسلہ جاری کر دیا"۔ (کشمکش)

اسی زمانہ میں جموں میں ایک ہندو تھانیدار نے جامع مسجد میں مولوی صاحب کو خطبہ پڑھنے سے روک دیا اور ایک عید پر پولیس نے اسلامیانِ جموں کو عید کی نماز پڑھنے سے بھی جبراً روکا۔ اب یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ایسے سنگین واقعات پر شیخ محمد عبداللہ خاموش رہتے۔ ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:۔

"میرے تقرر کے بعد جموں میں خطبۂ عید کی بندش اور قرآن کریم کی توہین کا واقعہ ہوا اور ڈھوڑ میں نماز عید کی ممانعت کی گئی۔ اس پے بہ پے مذہبی دل آزاری سے تمام خطہ کشمیر برافروختہ ہو گیا۔ جب جموں میں خطبۂ عید کی بندش اور قرآن کریم کی توہین کے واقعات کی خبر سرینگر میں پھیلی تو مسلمانوں کے رنج کی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنے دین پاک کی یہ کھلی ہوئی توہین دیکھ کر تلملا اُٹھے۔ ان افسوسناک واقعات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے جامع مسجد میں ایک جلسہ عام کا انتظام کیا گیا۔ جلسہ میں بہت سے ریزولیوشن منظور کئے گئے۔ اور مہاراجہ بہادر سے التجا کی گئی

کہ وہ مسلمانوں کی دلآزاری کرنے والے اہل کاروں کو سزا دے کر عوام کے مجروح دلوں پر تسکین کا پھاہا رکھیں ——— !!!

"اس جلسہ میں میری شرکت سے حکومت نے بڑا منایا۔ اور گورنر نے جامع مسجد کے دروازوں پر ایک نوٹس چسپاں کرایا۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ گورنر کی اجازت کے بغیر کوئی جلسہ یا تقریر مسجد میں نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ یہ حکم صریحاً مذہب میں مداخلت تھی۔ ہم نے تہیہ کر لیا کہ اسکی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا دیں گے۔ ہم نے ایک اور عام جلسہ کا اعلان کر دیا۔ اور اس میں گورنر کی اس نازیبا حرکت پر صدائے احتجاج بلند کی۔

"میری پبلک سرگرمیوں سے حکومت مشتعل ہو گئی اور حکام نے مجھ کو سیاسی لحاظ سے مردہ بنانے اور تمام قومی و ملکی تحریکات سے علیحدہ رکھنے کی خاطر مجھ کو مظفر آباد تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ مگر میں نے ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دی اور حکومت کو اس کے حکم کے جواب میں لکھ دیا کہ میں گورنمنٹ کا ملازم ضرور ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنے وطن عزیز کی توہین ہوتے دیکھ کر خاموش رہوں۔ میں

لہ اس واقعہ کو مؤرخ کشمیر محمد اسد اللہ قریشی کاشمیری نے یوں بیان کیا ہے ؎

"ریڈنگ روم پارٹی اور آل کشمیر مسلم سوشل اَپ لفٹ ایسوسی ایشن کی ان سرگرمیوں سے اندر ہی اندر ریاست میں انقلاب کا لاوا پکتا رہا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے دورۂ یورپ سے واپس کشمیر آنے کی خبر آگئی۔

جاگیردار اور سرکار پرستوں نے راجہ کے شاندار استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں

دیگر مسلمانوں کی طرح کبھی بھی اپنے مذہب کی توہین گوارا نہیں کروں گا اور اس توہین کا ارتکاب کرنے والے حکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں گا۔ میں نے

نوٹ بقیہ صفحہ نمبر (۸۴)

ریڈنگ روم پارٹی نے اس خالی خوشامدانہ استقبال کی مزاحمت کی اور شیخ محمد عبداللہ شیر کشمیر نے جو پارٹی کے صدر تھے، پارٹی کی طرف سے یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ ہم راجہ کا استقبال کرکے اپنے حقوق اور مطالبات علیحدہ پیش کریں گے۔ ہم عوام دشمن ٹوڈیوں کے خوشامدانہ استقبال کا ساتھ نہیں دیں گے، جنہوں نے ہمیشہ حقوق کو پامال کیا۔ اس سلسلہ میں خواجہ غلام نبی گلکار۔ خواجہ عبدالغنی ننگرو۔ خواجہ ثناء اللہ راتھر۔ خواجہ غلام احمد۔ خواجہ عتیق اللہ نواب بازار نے راتوں رات سرخ سیاہی سے قلمی پوسٹر لکھ کر شہر کے مرکزی مقامات پر لگا دئیے۔ جن میں عوام کی حقوق تلفیوں اور اُن کے انسداد کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے پیش نظر پارٹی نے جامع مسجد سرینگر میں پبلک جلسہ بلایا۔ مگر حکومت نے امتناعی نوٹس دیکر جلسہ کو روکنے کا حکم دیا۔ جس پر ریڈنگ روم پارٹی نے خواجہ گلکار کو امتناعی حکم توڑنے کے لئے پہلا ڈکٹیٹر مقرر کیا یہ ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے۔ انہوں نے پرجوش تقریر کرکے امتناعی نوٹس کو توڑا۔

دوسرے دن شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے مولانا عبدالمجید سالکؔ کی نظم ؎

تم ہی سے اے مجاہدو جہاں کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

پڑھی۔ جس پر شیخ صاحب کو حکومت نے سرینگر سکول سے مظفرآباد میں تبدیلی کا حکم دے دیا۔ مگر آپ نے ملازمت پر لات مار کر اس سے استعفا دے دیا اور ایجی ٹیشن میں کھلے بندوں حصہ لینا شروع کر دیا۔

سرکار کا ملازم ہو کر چند ٹھیکروں کے عوض اپنا ضمیر فروخت نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کر سکتا ہوں۔ حکام متعلقہ کا فرض ہے کہ وہ میرے کام کو دیکھیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ میں وقت معینہ پر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوتا ہوں یا نہیں۔ لیکن ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہموطنوں اور ہم مذہبوں کی اخلاقی، تمدنی اور معاشری حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ حکام متعلقہ نے میری بات پر کان نہ دھرا۔ اور میں نے اس بات کو محسوس کرتے اور جانتے ہوئے کہ انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ صرف یہی ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے، ایسی حکام کی روش پر زیادہ عرصہ چپ نہ رہ سکا۔ اور میں نے محکمہ تعلیم کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ اور کھلم کھلا میدان سیاست میں کود پڑا۔ حکام کا کینہ اس سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے میرا استعفےٰ منظور کرنے کی بجائے مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی تھا۔ لیکن جہاں استعفےٰ کے قبول کرنے سے حکومت کی مصالحت پسندی ظاہر ہوتی، وہاں میری جبری برطرفی سے اس کا کینہ آشکارا ہو گیا۔"

اس کے بعد بقول چودھری غلام عباس۔

اب وہ آزاد ہو گئے۔ اس برطرفی نے مسلمانان کشمیر کے جذبات کو ابھار دیا۔ اور ساتھ ہی شیخ صاحب کے لئے دلوں میں جگہ بھی پیدا ہو گئی۔

(کشمکش)

شیخ محمد عبداللہ کی قربانی اور جرأت سے عوام بے حد متاثر ہوئے اور وادئ کشمیر کے سب لوگ ان کے گرد جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ان حالات کو جب

کشمیر کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا میر واعظ نے دیکھا تو انہوں نے بھی
شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اور وادی کشمیر

"اسلام زندہ باد"

اور

"ماسٹر عبداللہ زندہ باد"

کے نعروں سے گونج اٹھی ÷

عوامی بیداری کا دور

عوامی بیداری کا دور

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے میدانِ سیاست میں آنے سے پیشتر کے حالات کا قبل ازیں اجمالاً تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سب واقعات کی کڑیوں کو ایک مسلسل زنجیر کی شکل دی جائے۔ تاکہ "تحریکِ آزادیٔ کشمیر" کی اہمیت اور افادیت کو اچھی طرح سے سمجھا جا سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے "تحریکِ آزادی کشمیر" کے مفہوم اور ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی حالات کو صوبائی تقسیم کی روشنی میں بیان کر دیا جائے جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ریاست جموں وکشمیر کی ہیئت ترکیبی کچھ اس طرح ہے۔

- صوبۂ کشمیر
- صوبۂ جموں
- صوبۂ لداخ
- صوبۂ گلگت

○— جاگیر پونچھ

صُوبہ کشمیر یوں تو اسلامیانِ کشمیر کی جد وجہد آزادی کی ابتدا سولھویں صدی عیسوی ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ جب کہ چک سلطانوں نے جنگ اقتدار کی رُو میں بہہ کر ناحق کشمیری عوام کو تختۂ ستم بنایا تھا۔ چکوں کے بعد مغلوں کا دور آیا پھر کشمیر کے ہندوؤں کی سازش سے پٹھانوں کو شکست ہوئی اور سکھ غالب آئے سکھوں نے جو مظالم کشمیر پر ڈھائے، اُن کی مثال تاریخ عالم میں ملنی محال ہے۔ اس دور میں بھی کشمیری عوام جد وجہد کرتے رہے، سکھوں کے بعد انگریز کشمیر پر قابض ہوئے اور انہوں نے بعد میں جموں کے راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ ریاست جموں وکشمیر کو پچھتر لاکھ شاہی روپیہ کے عوض فروخت کر دیا، اور اس طرح راجہ گلاب سنگھ تمام ریاست جموں وکشمیر بشمول لداخ وگلگت کا حاکم اعلےٰ بن بیٹھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کس قسم کا وحشی انسان تھا۔ اُس کے بارے میں شیخ غلام حیدر چشتی مرحوم بانی رکن ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن لکھتے ہیں:۔

"گلاب سنگھ بے حد سفاک، ظالم بے رحم اور حریص راجہ تھا۔ اُس نے جموں کی حکومت سنبھالتے ہی پہلے توڈوگرہ مخالفوں کو ہموار کیا اور اس کے بعد بھنبر۔ پونچھ۔ میرپور۔ راجوری اور کشتواڑ وغیرہ کے مسلمان حکمرانوں کو مکر وفریب سے قابو میں لا کر کسی کو "درگ" میں ڈالا (درگ کنوں کی شکل کا ایک گڑھا ہوتا تھا جس میں دشمن کو ڈالا جاتا تھا) کسی کی آنکھیں نکلوائیں اور کسی کو سامنے کھڑا کر کے کھال اتروادی۔ چنانچہ پونچھ کے ایک مسلمان راجے کو گرفتار کر کے گلاب سنگھ کے سامنے لایا گیا تو اس نے راجے کی کھال اتارنے کا حکم دیا۔ کھال سر کی طرف اتارنے میں دماغی صدمے سے آدمی جلد مر جاتا ہے اور اُسے کم اذیت

ہوتی ہے۔ لیکن پاؤں کی طرف سے کھال اتارنے میں آدمی دیر تک زندہ رہتا ہے اور مرنے سے پہلے زیادہ دیر تک اذیت اٹھاتا ہے۔ گلاب سنگھ کا ایک بیٹا بھی اس وقت موجود تھا۔ جب مظلوم راجے کی کھال ٹانگوں سے اوپر ادھیڑی جا چکی تو اس دردانگیز نظارے کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا۔ گلاب سنگھ نے بیٹے کی گردن پکڑ کر یہ کہتے ہوئے اس کا منہ مظلوم راجے کی طرف پھیر دیا کہ اگر یہ بزدلی دکھاؤ گے تو حکومت کیسے کرو گے"

جب کھال چھاتی تک اتر چکی تو بہادر مسلمان راجہ نے جس کے حواس اس وقت تک بجا تھے۔ پہلے پانی پینے کی اور پھر بیوی بچوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن ظالم گلاب سنگھ نے اس کی اس خواہش کو مسترد کر دیا۔ جب کھال گردن تک اتر چکی تو راجہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی"

(ہنگامہ کشمیر صفحہ ۸)

یہاں یہ امر باعث دلچسپی ہو گا کہ اس مہاراجہ گلاب سنگھ کی تعریف میں موجودہ بھارت کے ایک مشہور سیاسی فلاسفر اور سفیر سردار کے۔ ایم پانکار نے ایک تاریخی کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "ریاست کشمیر کی بنیاد"۔

جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ گلاب سنگھ بڑا دلیر انسان تھا۔ ظالم و وحشی مہاراجہ گلاب سنگھ کو "دلیر اور بہادر بنانے والے یہی صاحب ایک عرصہ تک چین میں بھارت کے سفیر اور اقوام متحدہ میں بھارت کی کشمیر کمیٹی کے رکن رہے ہیں" اور اب بھی پنڈت جواہر لعل نہرو کے امور خارجہ کے مشیروں میں سے ایک ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے ؎

وہی قاتل وہی مخبر وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

یہ تو حالت تھی ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ کی اور عوام وادی میں کن مشکلات سے دوچار تھے۔ اُن کی کہانی ایک غیر ملکی سیاح مسٹر ای۔ ایف نائٹ رکن مہم کرنل ڈیورنڈ (۱۸۹۱ء) سے سنیئے۔

"ہر سال گلگت کو رسد کا مال پہنچانے کے لئے ہزاروں کشمیری کسانوں اور مزدوروں کو جبراً مامور کیا جاتا ہے اور گلگت کا نام کشمیر کے دیہاتی باشندوں کے لئے "موت" کا مصداق بن چکا ہے۔ اور جب کشمیر کے بیگاری سرینگر سے گلگت تک سامان رسد لے جانے پر لگائے جاتے ہیں، تو ان کی حالت قابل رحم ہوتی ہے۔ دربار کشمیر مہینوں گھروں سے باہر رہنے والے ان بدقسمت لوگوں کو کسی قسم کا آرام پہنچانے کا خیال نہیں کرتا، بلکہ ان کی جان کی حفاظت تک سے بے اعتنائی برتی ہوتی ہے۔ یہ بیگاری گلگت کی سنگلاخ اور دشوار گذار راہوں پر منوں بوجھ اُٹھا کر بڑے صبر کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور گلگت ایسے بے برگ و گیاہ اور برفانی خطے میں سامان رسد پہنچاتے ہیں۔ ان میں سے کئی بھوک پیاس اور تھکاوٹ سے چُور ہو کر پگڈنڈیوں پر ہی جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں نیم عریانی کے باعث برفانی سردیوں کی تاب نہ لا کر مرجاتے ہیں۔ جب کسی شخص کو ان کے گاؤں میں بیگار کے لئے پکڑا جاتا ہے تو گھروں میں کہرام مچ جاتا ہے۔

اس کے بیوی بچے چیختے اور چلاتے ہیں اور اس بدنصیب انسان سے چمٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ اب وہ اس کی صورت دوبارہ نہیں دیکھیں گے"۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے خلاف جیسے ہی موقعہ میسر آیا کشمیری عوام نے جدوجہد کی اور مہاراجہ نے بھی جہاں تک ممکن ہو سکا، ایسی تحریکوں کو کچلنے کی کوشش جاری رکھی۔ جس کے نتیجے میں کشمیر کے کچھ لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں میں جا بسے اور انہوں نے وہاں پر مہاراجہ کشمیر کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا ۱۹۱۶ء میں مسٹر شارپ مشیر تعلیم برطانوی ہند کے سامنے کشمیری رہنماؤں نے اپنی داستان درد بیان کی پھر ۱۹۲۶ء میں ایک باقاعدہ انجمن جو ریڈنگ روم پارٹی کے نام سے مشہور ہوئی معرض وجود میں آئی جس کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کی بحالی تھا۔ مذہبی طور پر وادئ کشمیر میں مسلمان میرواعظ کشمیر کے زیر اثر یا "سواد خانقاہی" کے جھگڑوں میں مبتلا تھے مسلمانوں کی طرح کشمیر کے ہندو پنڈت بھی ڈوگرہ حکومت کے مظالم کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ لیکن مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں میں کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا، جو ان کڑیوں کو اکٹھا کر کے اُن سے ایک مضبوط سیاسی جماعت کی تشکیل کرتا۔ چنانچہ ایک عرصہ تک ستم رسیدہ اہل کشمیر کے جذبات اندر ہی اندر کھولتے رہے اور جیسے ہی شیخ محمد عبداللہ کی جرأت مندانہ قیادت سامنے آئی سب اس کے تابع ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کشمیر کے حالات اس کے منتظر تھے۔ کہ شیخ محمد عبداللہ جیسی کوئی شخصیت آگے بڑھے اور لوگ اس کا استقبال کریں۔

صوبہ جموں۔ صوبہ جموں میں سیاسی تحریک صوبہ کشمیر کی نسبت بہت پہلے شروع

ہو چکی تھی۔ کیونکہ جموں کے لوگ پنجاب سے زیادہ قریب تھے اور ان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی پر پنجاب کے لوگوں کا اثر تھا۔ چنانچہ جموں میں ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن، اور انجمن اسلامیہ کے نام سے جو انجمنیں قائم تھیں، وہ در پردہ سیاسی حالات کو بدلنے کے لئے کوشاں رہتی تھیں۔ گو بظاہر ان انجمنوں کا کام علمی و ادبی مباحثے کرانا، یتیم خانے یا سکول جاری کرنا۔ یا قبرستان اور جنازگاہ تعمیر کرانا تھا۔ مگر حقیقتاً ان کے اراکین کی اکثریت ریاست جموں و کشمیر میں ذمہ دار نظام حکومت قائم کرنے کی خواہش مند تھی۔ چونکہ ابتدا میں ان کے عہدیدار عام طور پر سرکاری ملازم اور پنشنر ہوتے تھے، اس لئے حکومت کے خلاف آواز اُٹھانا اُن کے بس کا روگ نہ تھا۔ آخر اس اہم ترین کام کو جموں کے ایک مقتدر قومی رہنما سردار گوہر رحمان نے سنبھالا۔ اور نہایت جرأت سے تحریک کو منظم کیا جموں کے نوجوانوں نے اس تحریک کو لبیک کہا اور یوں آزادی کی جدوجہد کی طرح پڑی۔ ان نوجوانوں میں شیخ عبدالحمید، چودھری غلام عباس، شیخ غلام قادر۔ مسٹر اے۔ آر ساغر۔ عبدالمجید قریشی، غلام حیدر خاں غوری، منشی معراج الدین احمد، مستری یعقوب علی بابو محمد عبداللہ قابل ذکر ہیں۔ اور تحریک کو پس پردہ چلانے والوں میں ملک مقبول احمد منشی رحمت اللہ بٹ، منشی غلام علی، بابو طفیل احمد، مولوی رفیع الدین، منشی غلام نبی، پروفیسر عبدالرشید، خلیفہ عبدالرحیم قیس شیروانی اور اُن کے رفقاء کار شامل ہیں۔[۱]

جب جموں میں نوجوانوں کی تنظیم مکمل ہو گئی۔ تو اس کا الحاق صوبہ کشمیر کی جماعت سے کر لیا گیا، جو انہی خطوط پر وادی میں سرگرم عمل تھی۔

اسی طرح پونچھ میں تحریک کو جاری کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئیں وہاں پر پہلے ہی اس کارِ خیر کو چند باہمت نوجوان، جن میں صوبیدار، خاں محمد خاں،

---

[۱] صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مولانا غلام حیدر جنڈالوی فتح محمد خاں کریلوی اور ان کے رفقاء کار قابلِ ذکر ہیں، سرانجام دے رہے تھے۔ اور اسی طرح گلگت و لداخ میں بھی اصلاحی کوششیں جاری تھیں۔

میرپور میں غازی الٰہی بخش۔ یار محمد خاں اور ان کے رفقاء کار اور بھدرواہ میں ملک غلام محمد اور ملک غلام رسول بھدرواہی وغیرہ ہم بھی مصروفِ عمل تھے۔ اسی طرح ریاست جموں و کشمیر کے دُوسرے علاقوں میں کشمیر سرکار سے مخالفت کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ اب ضرورت ان زیرِ زمین کوششوں کو یکجا کرنے کی تھی جنھیں خود کشمیریوں نے اپنی مساعی سے اکٹھا کر کے ایک جماعت میں سمو لیا۔ چنانچہ بقول مولانا عبدالمجید سالک —

"کشمیر کے غیور مجاہد کارکنوں نے آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء کے نام سے اپنی سیاسی تنظیم قائم کی جس کے صدر شیخ محمد عبداللہ مقرر ہوئے، جو اس زمانہ میں "شیرِ کشمیر" کہلاتے تھے۔"

(سرگزشت از سالک)

اس طرح ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی قیادت کی عنان شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں آگئی ؎

بقیہ صفحہ ۹۶ نوٹ ۱ ڈاکٹر غلام احمد جرّاح۔ سیّد تاج شاہ۔ قاضی خورشید عالم۔ قاضی شمس الدین۔ منشی محمد بشارت۔ بابو علی محمد۔ منشی محمد صادق اور حبیب کیفوی۔

تحریک کا مفہوم

[illegible]

تحریک کا مفہوم

۱۹۳۲ء میں تحریکِ حریتِ کشمیر کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، اور قومی تحریکیں جو ریاست کے مختلف حصوں میں چھوٹے چھوٹے ندی نالوں کی صورت میں بہہ رہی تھیں، اب ایک وسیع دریا کی صورت میں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر ڈوگرہ سامراج نے اندرونِ ریاست اور بیرونِ ملک طرح طرح کے افسانے تراشے، اور تحریکِ حریتِ کشمیر کو اپنے نازیبا اور سنگدلانہ حربوں کا نشانہ بنایا اور اس پروپیگنڈے کو ہوا دی کہ "تحریکِ حریتِ کشمیر" محض "وادیٔ کشمیر" کے لوگوں کی وقتی اور معاشی شکایتوں کا ردِّ عمل ہے یا جموں شہر یا پونچھ کے بسنے والوں کی ہنگامی اور جذباتی نعرہ بازی کا مظاہرہ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک کی اپنی ایک تاریخ تھی، جس کی اساس قومی آزادی اور حقِ خود ارادیت کے ٹھوس اصول تھے چنانچہ تحریکِ حریتِ کشمیر کی وضاحت غلام محمد صادق نے ایک بار یوں کی تھی "جب ہم کبھی کشمیر کو سیاسی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس وقت ہماری مراد

ساری ریاست سے ہوتی ہے، اور آج تک الفاظ "ریاست کشمیر" سے کسی کو یہ دھوکا نہیں لگا ہے کہ اس کے معنی ریاست کا صرف وہ حصّہ ہے، جس کو کشمیر کہتے ہیں۔ بلکہ اس کا اطلاق اس تمام علاقے پر ہوتا ہے جو مہاراجہ ہری سنگھ کے قبضہ میں ہے" کیونکہ "علاقہ پونچھ، میرپور، سارے کا سارا اور جموں صوبے کا بیشتر حصہ ۱۸۴۶ء کے بدنام معاہدے کی رُو سے ہی ریاست میں شامل کر لیا گیا ہے اور ان علاقوں میں بسنے والے لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی اسی معاہدے کی رُو سے بازار میں بکنے والی اشیاء کے طور پر خرید کر لیا گیا ہے۔" چنانچہ شیخ محمد عبداللہ صاحب شیرِ کشمیر کی گرفتاری کے فوراً بعد جب پونچھ کے لاکھوں باشندوں نے احتجاج کیا۔ یہ احتجاج اس لئے تھا کہ وہ اسی تحریک کے ذریعے سے اپنی دیرینہ اور جائز خواہش کا اظہار کر سکتے ہیں جس کے تحت وہ وقتاً فوقتاً ایک آزاد پونچھ کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ انہیں یہ تحریک وادیٔ کشمیر میں بسنے والے ۳۰ لاکھ لوگوں کی ہی تحریک نظر نہیں آتی تھی۔"

چونکہ کشمیری قومیت کا سیاسی سانچہ سری نگر میں تیار ہوا تھا اور اتفاق سے یا قدرتی طور پر کشمیر کی تحریک جدید یا "نیا کشمیر" کا خالق شیخ محمد عبداللہ وہیں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے تحریک کی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر ہی بنتا۔ اور یہ بات اس قدر مقبول ہوئی کہ جب کبھی کسی بھی سیاسی تحریک نے ابھرنا چاہا تو سری نگر کا ہی رُخ کیا۔ حالانکہ اگر "آزاد کشمیر" کی تحریک کا رُخ ریاست جموں و کشمیر کے سرمائی پایۂ تخت جموں شہر کی جانب موڑا جاتا تو آج ریاست کا نقشہ یقینی طور پر مختلف ہوتا۔ مگر "آزاد کشمیر" تحریک کے داعیوں نے ایسا نہ سوچا اور اب کی بار بھی انہوں نے حالات کا جائزہ نہ لیا۔

اور اسی "ہنگامہ پروری" کی پیروی کی، جس کی وجہ سے "تحریک حریت کشمیر" آگے بڑھنے کی بجائے ساکت اور معطل ہوتی رہی۔ غرضیکہ تحریک کشمیر کا مفہوم تمام ریاست جموں و کشمیر کے بسنے والوں کی آزادی اور ریاست کی آزادی ہے اور ریاست کا الحاق وہاں کے عوام کی اپنی خواہشات میں مضمر ہے۔ جس کے اظہار کی صورت صرف استصواب رائے عامہ ہے۔

عبدالقدیر خاں اجنبی مسافر۔ گم شدہ محسن

تاریخ "تحریک حریت کشمیر" کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی نشوونما میں کتنے گمنام اور مخلص لوگوں نے سخت اذیتوں اور پابندیوں کے باوجود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ڈوگرہ استبداد کے خلاف علم جہاد بلند کر کے کشمیریوں کو آزادی اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے کی ترغیب دلائی۔ یہ درست ہے کہ اس تحریک کی ابتدا خود ریاستی عوام نے کی مگر اس صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس تحریک کو حقیقی سیاسی تحریک کا رنگ غیر ریاستی عوام کی انفرادی معاونت اور اعانت ہی سے ملا۔ اور تحریک حریت کشمیر ہر دور میں اپنے غیر ملکی معاونین کے پرخلوص تعاون سے چلتی اور بڑھتی رہی[1] ان غیر ملکی محسنوں میں سینکڑوں ہزاروں ایسے انسان بھی ہیں جنہوں نے آزادی کشمیر کے لئے جام شہادت نوش فرمایا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور جائیدادیں ضبط کروائیں۔ ان حریت پسندوں میں ایک عبدالقدیر خاں بھی ہیں جو پشاور کے رہنے والے اور ایک انگریز سیاح کے ملازم تھے۔ جن دنوں ریاست میں توہین قرآن پاک کا واقعہ پیش آیا یہ سری نگر میں تھے۔ ان کی غیور اور جوشیلی طبیعت نے قرآن پاک کی بے حرمتی گوارا نہ کی اور انہوں نے مسلمانوں کے ایک اجتماع منعقدہ جامع مسجد میں

---

[1] گو بعض اوقات ان معاونین کے باہمی اختلافات نے تحریک حریت کشمیر کو شدید ترین نقصانات پہنچائے

ایک ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"مسلمانوں کو دنیا جہاں کی پادشاہی سے زیادہ اپنے مذہب اور قرآن کریم و رسول اکرم کی عزت عزیز ہے۔ مسلمان کبھی بھی مداخلت فی الدین یا توہین کتاب مقدس گوارا نہ کرے گا۔"

اس پُرجوش تقریر پر جہاں عوام کے دل بھر آئے، وہاں حکومت کشمیر سخت سیخ پا ہوئی اس نے کشمیریوں کے اس محسن اور عاشقِ رسول کو گرفتار کر کے ہری پربت قلعہ میں قید کر دیا اور اس کے خلاف مقدمہ بغاوت کھڑا کر دیا گیا۔ ۱۳ر جولائی کو عبدالقدیر خاں کے مقدمۂ بغاوت کے فیصلہ کا دن تھا۔ اس روز ہزاروں انسان جیل کے باہر جمع ہو گئے۔ اُن پہ حکومت نے گولی چلادی۔ جسے کشمیریوں نے اپنے سینوں پر روکا۔

اس واقعہ کو کشمیر کے اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر جی۔ ای۔ ایس۔ سی۔ ویکفیلڈ نے اپنی کتاب (Recollection) میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"فوج کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں میں نے کشمیریوں کی دو کمپنیاں بھرتی کرنے کی تجویز کی۔ اس پر ایک دن ہز ہائنس نے مجھے بتایا کہ اس کے دادا مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کشمیریوں کی ایک پوری رجمنٹ بھرتی کی۔ انہیں وردیاں پہنائیں، اور پورے چھ ماہ تک اُن کو سری نگر میں ڈرل کرائی گئی۔ اس کے بعد اس رجمنٹ کو جموں کی طرف مارچ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کے بعد اُن کے افسروں کا ایک وفد درخواست لے کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے پاس آیا کہ اس مارچ کے سلسلے میں حفاظت کے لئے پولیس کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ یہ سنکر مہاراجہ نے اس رجمنٹ کو توڑ دیا تھا۔

(صفحہ ۱۹۳)

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد مسٹر ویکفیلڈ وزیر اعظم کشمیر جن کے بارے میں چوہدری غلام عباس کا یہ خیال ہے کہ اگر آج یہ کہا جائے کہ مہاراج کا اوّل نمبر کا بہی خواہ اور نمک حلال وزیر تھا تو اس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا" لکھتے ہیں۔

"... لیکن اس میں اب تبدیلی آگئی ہے۔ فسادات کے دوران جو ۱۹۳۱ء میں ہوئے جتنے بھی کشمیری مرے، اُن کے سارے کے سارے زخم سینے پر تھے پشت پر نہیں تھے۔

"RECOLLECTIONS" (صفحہ ۱۹۴)

پھر ان شہیدانِ وطن کی نعشوں کو جامع مسجد میں لایا گیا۔ جہاں لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ اور وہ شیخ محمد عبداللہ کے اردگرد جمع تھے۔ بقول چودھری غلام عباس

"دوپہر کے وقت شیخ محمد عبداللہ کو بھی جامع مسجد میں جب کہ وہ میرواعظ کی معیت میں شہیدوں کی نعشوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ گرفتار کر لیا گیا"

گرفتاری سے قبل شیخ محمد عبداللہ نے اس سارے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم سے کہا جاتا ہے کہ حکومت کا مذہب انصاف ہے۔ لیکن یہ انصاف (نعشوں کی طرف اشارہ کر کے) ہمارے سامنے ہے۔ یہ دیکھو! مسلمانو کہ ایک مسلمان کے خون کا قطرہ جہاں کی بادشاہی سے زیادہ عزیز ہے اس لئے یہ خون کبھی رائیگاں نہیں جائے گا" [1]

---

[1] خواجہ غلام نبی گلکار انور کا بیان ہے کہ جب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور ان کو حکومت کشمیر نے گرفتار کر کے قلعہ ہری پربت کی کوٹھڑی میں بند کر دیا تو ہم نے یہ وعدہ کیا کہ اس

غرضیکہ ۱۳ جولائی کی صبح کشمیریوں کی آزادی کی جنگ کا نعرہ لے کر آئی۔ اور بقول چودھری غلام عباس:

یہ دن کیلنڈر میں موجود نہ ہوتا تو یقیناً ریاست کشمیر کی سیاسی تاریخ جو ۱۹۳۱ء سے لے کر آج تک مرتب ہو رہی ہے؛ اور آئندہ بھی مرتب ہوتی رہے گی بالکل مختلف ہوتی"۔

اس واقعہ کے بارے میں کشمیر کے ایک دوسرے لیڈر پنڈت پریم ناتھ بزاز کا خیال ہے۔

"۱۳ جولائی کا واقعہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے تاریخ کشمیر کا ایک عظیم ترین سانحہ ہے۔ تنگ نظر اور فرقہ پرست ہندوؤں نے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس روز جیل پر جو یورش ہوئی۔ اُسے ہندو قوم پر حملہ قرار دیا ہے۔ مگر اس مظاہرہ کا پس منظر ثابت کرتا ہے کہ اس عوامی شورش کی تہ میں جو جذبہ کام کر رہا تھا، وہ آزادی کی تڑپ اور ڈوگرہ سامراج کے خلاف نفرت تھی۔ لہٰذا ہجوم نے جیل پر یورش کی۔ اُسے ہندوؤں پر حملہ ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مظاہرین اگرچہ سارے کے سارے مسلمان

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۰۵) وقت تک دم نہیں لیں گے، جب تک کہ ریاست کو آزاد نہیں کرا لیں گے"۔ اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے ان کو اپنا یہ خواب سنایا۔

"کہ میرے (شیخ محمد عبداللہ) ہاتھ سے کسی نے لعل چھینا۔ مگر وہ اس کے ہاتھ میں پتھر ہو گیا۔ جب دوبارہ میں نے چھینا تو وہ پتھر پھر چمکنے لگا"

تھے۔ مگر اس کی رُوح سراسر غیر فرقہ وارانہ تھی۔ یہ مظاہرہ ظالم کے خلاف مظلوم کا اعلان جنگ تھا۔ اور زیر استبداد کا جابر و غاصب کے خلاف نعرۂ بغاوت تھا۔" (INSIDE KASHMIR)

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اس سارے سانحہ میں جو کردار ادا کیا، وہ قابلِ رشک ہے۔ انہوں نے اس وقت نہایت جرأت سے کام لے کر حکومتِ کشمیر کو مسلمانان کشمیر کے مطالبات پر مشتمل ایک الٹی میٹم دے دیا۔ ابھی اس الٹی میٹم کی میعاد پوری بھی نہ ہوئی کہ حکومت نے ان کو پابندِ سلاسل کر دیا۔ مصنّف "شیر کشمیر" میر نیاز احمد کا بیان ہے کہ جس وقت حکومتِ کشمیر نے ان کو گرفتار کیا۔ آپ

"امیرا کدل پوسٹ آفس کے سامنے ایک ہاؤس بوٹ میں اسلامیہ ہائی سکول کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے اور ہاؤس بوٹ میں دریا پر مسلم خواتین کے لئے حمام بنانے کی خاطر بھی چندہ جمع کر رہے تھے۔ پولیس انہیں موٹر میں بٹھا کر بادامی باغ گارڈ میں لے گئی۔ یہ چھاؤنی مہاراجہ بہادر کے محلات گپکار کے بالکل نزدیک واقع ہے۔ آپ کو چند روز یہیں رکھا گیا۔ پھر ہری پربت جیل میں منتقل کیا گیا۔ آپ کو پہلے چار دن ایک ہی جگہ چھوڑ دیا گیا اور کسی نے کھانے پینے کے لئے کچھ نہ دیا۔"

شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے ساتھ ہی حکومت کشمیر نے جموں شہر کے لیڈروں چوہدری غلام عباس، سردار گوہر رحمٰن، مستری یعقوب علی اور مسٹر عبدالحمید اور کشمیر کے مسٹر غلام نبی۔ عبدالرحیم، غلام محمد اور غلام احمد عشائیؒ کو بھی گرفتار کر لیا۔

عوام کا احتجاج ۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقائے کار کی گرفتاری

کی خبر تمام ریاست میں جنگل آگ کی طرح پھیل گئی اور بقول میر نیاز احمد

"شیر کشمیر کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ جونہی آپ کی گرفتاری کی خبر عوام تک پہنچی، وہ مشتعل ہو گئے اور آہ و بکا شروع ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کی عزیز چیز کھو گئی ہے۔ مولانا (شیر کشمیر) کی گرفتاری کے بعد ۱۷ روز مسلسل ہڑتال رہی۔ یہ ہڑتال تاریخ کشمیر میں بے مثال تھی، اور اگرچہ حکومت نے بہتیری کوشش کی ہڑتال کھل جائے لیکن مسلمان کہتے تھے کہ جب تک ہمارا عبداللہ نہیں رہا ہوتا اور وہ ہم کو ہڑتال کھولنے کا حکم نہیں دیتا۔ ہم ہرگز ہرگز دکانیں نہیں کھولیں گے۔"

شیخ محمد عبداللہ کا حکم

"ابھی ہڑتال کو ۱۷ روز ہی ہوئے تھے کہ میر واعظ یوسف شاہ صاحب نے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانو! شیر کشمیر جلد ہی رہا کر دیئے جائیں گے۔ تم دکانیں کھول دو۔ اس پر مسلمانوں نے کہا کہ جب تک شیر کشمیر خود حکم نہیں دیتے۔ ہم ہرگز دکانیں نہیں کھولیں گے آخر شیر کشمیر نے جیل سے رقعہ بھیجا جو عوام کو پڑھ کر سنایا گیا۔ عوام نے اس رقعہ کے سننے کے بعد بادل ناخواستہ دکانیں کھول دیں۔ اس ہڑتال اور فساد میں مسلمانوں کا ۲۵ لاکھ سے زائد نقصان ہوا لیکن انہوں نے اپنے محبوب حضرت شیر کشمیر اور حقوق کی خاطر سب کچھ بخوشی گوارا کر لیا۔"

مشروط رہائی سے انکار

چودھری غلام عباس جو ریاستی سیاست میں پہلے شیخ محمد عبداللہ کے دست راست تھے اور بعد ازاں ان کے سب سے بڑے سیاسی حریف بنے اپنی کتاب "کشمکش" میں لکھتے ہیں

کہ شیخ محمد عبداللہ ہمیشہ ہی "جیل سے چور دروازہ کے راستہ باہر نکلتے ہیں"۔ انہوں نے ایسا کیوں لکھا۔ یہاں اس پر بحث تو نہیں کی جائے گی۔ البتہ عوام کی اطلاع کے لئے (جن کا حافظہ بقول سیاسی مبصرین کے کمزور ہوتا ہے) ایک ابتدائی واقعہ درج ذیل کیا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ خود اندازہ لگالیں کہ چودھری غلام عباس کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے؟

مصنف "شیر کشمیر" کا بیان ہے۔

"یکم اگست کو شام کے ۵ بجے وزیر اعظم کشمیر سر ہری کشن کول، مولانا آزاد جو کہ کرنل ہاکسر کی معیت میں حالات کشمیر کا مطالعہ کرنے کے لئے سری نگر گئے ہوئے تھے۔ اور ایک مجسٹریٹ جیل میں حضرت مولانا شیر کشمیر اور دیگر نظر بندوں یعنی عبدالرحیم۔ غلام نبی۔ غلام عباس۔ یعقوب علی۔ گوہر رحمٰن وغیرہ کے پاس گئے۔ وزیر اعظم نے حضرت مولانا مکرم (شیخ محمد عبداللہ) کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو اس شرط پر رہا کیا جاتا ہے کہ آپ ضمانت داخل کریں۔ مولانا نے جواب دیا۔ کہ ہم ہرگز ضمانت داخل نہیں کریں گے خواہ ہمیں تمام عمر جیل میں کاٹنی پڑے۔ وزیر اعظم نے پھر کہا کہ آپ لوگ یہ عہد کریں کہ ہم جیل سے نکل کر تقریریں نہیں کریں گے تو ہم آپ کو رہا کر دیں گے۔" حضرت مولانا نے فرمایا کہ یہ پابندی بھی منظور نہیں۔ وہ مجاہد اعظم جس کی رگ رگ میں آزادی کا خون دوڑ رہا ہو کیسے مشروط رہائی پسند کر سکتا تھا۔ جب وزیر اعظم نے دیکھا کہ حضرت مولانا کسی صورت بھی مشروط رہائی پسند نہیں کرتے اور آپ کا ایسا عزم نہیں کہ اُسے کسی طرح

ڈگمگایا جا سکے تو انہوں نے آپ سے کہا کہ کم از کم آپ یہ تو عہد کیجئے کہ ہم جیل سے باہر نکل کر کوئی ایسی تقریر نہیں کریں گے جس سے دو قوموں کے درمیان نفرت پیدا ہوتی ہو۔ یا دوسری قوم کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔ یا حکومت کے خلاف غیر وفاداری کے جذبات پیدا ہوتے ہوں"۔ حضرت مولانا (شبیر کشمیری) نے جواب دیا کہ ہم تقریر سے باز نہیں رہیں گے لیکن ہم نے کبھی کوئی ایسی تقریر نہیں کی جس سے دوسری قوم کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔ حکومت کی مرضی ہے ہمیں رہا کرے یا قید رکھے لیکن ہمیں بتایا جائے کہ ہمیں کس جرم کی بنا پر نظر بند کیا گیا ہے اور ہم نے کونسی باغیانہ تقریر کی ہے۔ اس موقعہ پر مولانا ابوالکلام آزاد بھی موجود تھے۔ وہ حضرت شبیر کشمیری کی جرأت آموز تقریر سنکر عش عش کرنے لگے اور ان کی راست گوئی سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے حکومت کا مہمان ہونے کے باوجود یہ حق کہہ دیا کہ حکومت نے حضرت مولانا اور دیگر نمائندگان کو بے وجہ گرفتار کیا ہوا ہے۔ اس لئے ان کو غیر مشروط طور پہ رہا کر دیا جائے"۔ پھر شام کے چھ بجے کے قریب گورنر کشمیر مجسٹریٹ اور مولوی عبداللہ وکیل جو وزیر اعظم کے ہمراہ تھے واپس چلے گئے۔ اس کے بعد مہاراجہ بہادر کے حکم سے حضرت مولانا شبیر کشمیر اور ان کے نظر بند ہمرائیوں کو رات کے دس بجے کے قریب رہا کر دیا گیا"۔

یہ واقعہ اور شیخ محمد عبداللہ کی حالیہ قید اور اس سے پیشتر کی اسیری کی داستان

سب کے سامنے ہے۔ کہ انہوں نے باوجود حکومت کی مساعی اور ہندوستان کے بڑے بڑے بااثر لیڈروں اور لوگوں کے کہنے کے جیل سے نکلنا گوارا نہیں کیا تاکہ "تحریک آزادی کشمیر" کے مقدس مشن پر کوئی دھبہ نہ آجائے۔ اس واقعہ کی تصدیق سردار گوہر رحمن نے بھی کی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو کہا کہ آپ تک کشمیر حکومت نے صحیح حالات نہیں پہنچائے۔ آپ کشمیر کے حالات کا اندازہ تبھی لگا سکتے ہیں کہ خود یہاں پر عام کشمیریوں کی سی زندگی بسر کریں اور پھر دیکھیں کہ ہم لوگ کن تکالیف سے دوچار ہیں۔ اس پر مولانا ابوالکلام آزاد خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے حکومت کشمیر کو ہماری رہائی کے بارے میں کہہ دیا۔ اس کے برعکس خود چودھری غلام عباس کی کیا عادت ہے۔ اس ضمن میں وہ خود کہتے ہیں:۔

"میں نے مہتہ مشیر مال کے خلاف تقریر کی جس میں اس پر بے تحاشا الزامات عائد کئے۔ حکومت نے مجھ پر ۱۲۴ الف مقدمہ چلانا چاہا۔ راجہ محمد افضل خان گورنر جموں نے کہا کہ اگر میں پرائم منسٹر کے سامنے اظہار معذرت کر دوں تو حکومت مقدمہ چلانے کا ارادہ ترک کر دے گی کیونکہ بقول اُن کے کرنل کالون پرائم منسٹر تمہارے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا دل سے مخالف ہے۔ میں نے اس بارے میں کسی سے مشورہ نہ لیا اور ایک روز کرنل کالون کے پاس جا کر اظہار افسوس کر دیا۔"

(کشمکش)

یہ بات دیگر ہے کہ بعد میں معافی مانگنے پر چودھری غلام عباس خود کو

"بدترین مخلوق" اور "سیاسی مجرم" تصور کرنے لگے۔ اور وہ یہ "محسوس کرنے لگے کہ میرا دماغ معطل ہو چکا ہے۔ اور میں دوسروں کے تابع ہوں۔"

(کشمکش)

جیل سے رہا ہونے کے بعد شیر کشمیر نے ۲۰ اگست کو اسلامیان

صدائے حق کشمیر سے جامع مسجد میں خطاب کیا۔ اب اس جلسہ کی روداد ملاحظہ فرمائیے۔

"شیخ صاحب نے نہایت درد بھرے لہجہ میں تلاوت قرآن مجید شروع کی۔ جس سے حاضرین پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کو یہ امانت ورثہ میں ملی ہے۔ کہ مصیبت کا صبر کے ساتھ مقابلہ کریں۔ انبیاء علیہم السلام کے مصائب اور صبر ایوب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جیل میں مجھے آپ لوگوں ہی کی فکر تھی اور ڈرتا تھا کہ اپنی سادگی اور کمی تعلیم کی وجہ سے آپ کسی پھندے میں نہ پھنسائے جائیں شہداء کے خون نے ہماری تحریک کی بنیادیں پتھر سے زیادہ مضبوط بنادی ہیں۔ ہم مہاراجہ بہادر کے وفادار ہیں اور نہیں چاہتے کہ انہیں بیجا تکلیف دیں۔ لیکن ہم اپنے مطالبات پیش کرنے میں ہرگز کوتاہی نہیں کریں گے خواہ اس کے عوض ہمیں تختہ دار پر ہی کیوں نہ کھینچا جائے۔

شہر میں مسلمانوں پر جو ظلم ہوا ہے اس کے زخم ہمارے سینوں پر موجود ہیں۔ تاہم ہم صبر سے کام لینا چاہتے ہیں کشمیری پنڈت ہمارے

بھائی ہیں اور ان سے ہمیں ہرگز ایسی توقع نہ تھی جس کا تجربہ ۱۳ جولائی اور ۱۸ جولائی کو ہؤا ہے تاہم ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں بے شک تکلیف ہو۔ لیکن ہمارے کشمیری پنڈت بھائیوں کو ہمارے خلاف کوئی وجۂ شکایت نہ ہو۔

مجھے اس بات کا سخت رنج ہے کہ ہندو اخبارات اور ہمارے کشمیری پنڈت بھائی یہ مشہور کر رہے ہیں کہ ہم نے مہاراجہ بہادر اور حکومت کشمیر کے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے۔ میں سب مسلمانوں کو جو اس وقت خانۂ خدا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس قرآن شریف کا (شیخ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دکھایا) واسطہ دے کر دریافت کرتا ہوں کہ کیا میں نے خفیہ یا علانیہ کنایتہً یا اشارتہً کبھی مہاراجہ بہادر یا حکومت کشمیر کا تختہ الٹنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے خفیہ پولیس کے رپورٹروں اور افسروں کو چیلنج دیا کہ آؤ حلفیہ بیان کو نوٹ کر کے مہاراجہ بہادر تک پہنچاؤ۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری تقریروں کی صحیح رپورٹیں مہاراجہ بہادر تک نہیں پہنچائی جاتیں جس کی وجہ سے ان کے دل میں مخالفت کا بیج بویا جا رہا ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ مہاراجہ بہادر جلسوں میں خفیہ طور پر آکر دیکھیں کہ مسلمانوں پر کیا مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔"

شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی ہردلعزیزی اور تحریک کی کامیابی کو دیکھ کر ریاست کے کچھ خود غرض لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ حکومت سے شیخ محمد عبداللہ نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اس واقعہ کو چودھری غلام عباس نے خود اس طرح تسلیم کیا ہے

کہ گویا بھی وہ عنصر تھا۔

"ہو سری نگر میں عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی مقبولیت اور شہرت کو برداشت نہ کر سکتے تھے" (کشمکش)

اس واقعہ کے بعد حکومت اور عوامی لیڈروں میں باہمی سمجھوتے کے لئے بات چیت ہونے لگی مگر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء کار اپنے مطالبات سے پیچھے نہ ہٹے اور سرہ لال کمشن (جس کا مسلمانان کشمیر نے بائیکاٹ کیا تھا) مڈلٹن کمشن، اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے وکلا کی مساعی سب ناکام ہوئیں۔

گلانسی کمشن اور کشمیر

۱۳ جولائی اور اس کے بعد کے واقعات پر تحقیقات کرنے کی غرض سے حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا جو گلینسی کمیشن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کمیشن کی ہیئت ترکیبی یہ تھی:

مسٹر بی۔ جے گلینسی (پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ آف انڈیا) صدر

غلام احمد عشائی ——— مسلم نمائندے (صوبہ کشمیر)

پریم ناتھ بزاز ——— ہندو نمائندے (صوبہ کشمیر)

چودھری غلام عباس ——— مسلم نمائندے (صوبہ جموں)

ایل۔ این۔ شرما ——— ہندو نمائندے (صوبہ جموں)

اس کمیشن کے سامنے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ سب سے پہلے گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ انہوں نے نہایت جرأت اور تفصیل کے ساتھ کشمیر کی تحریک کا پس منظر اور مہاراجہ کی حکومت کے مظالم اور کشمیری عوام کے مطالبات کو پیش

کیا، اور بقول چودھری غلام عباس:

"شیخ محمد عبداللہ نے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شکایات حسب دلخواہ پیش کیں۔ صوبہ جموں کے ہندو ممبر نے عادت کے مطابق بے ربط، بے مطلب اور غیر متعلقہ جرح کی"

اور وہ بروایت خود "خاموشی کے ساتھ کمیشن کی کارروائی کا جائزہ لیتے رہے" کمیشن کے روبرو شیر کشمیر کی حق گوئی اور ان کی سیاسی سرگرمیوں سے خائف ہو کر حکومت نے شیر کشمیر کو ۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کو چودھری غلام عباس کے الفاظ میں بلاوجہ گرفتار کر لیا۔ اور چودھری غلام عباس خود یہی سوچتے رہے کہ میں بھی گرفتار ہو جاؤں یا کمیشن کے ساتھ باقاعدہ تعاون جاری رکھوں۔

شیر کشمیر کی اس گرفتاری سے صورت حال مزید بگڑ گئی۔ عوام نے مشتعل ہو کر حکومت کے خلاف عملی اقدامات کرنے شروع کر دیئے جس کی بنا پر تمام ریاست میں مارشل لاء کا نفاذ کر کے برطانوی ہند سے برطانوی فوج "امن قائم" کرنے کے لئے بلائی گئی۔

اس دوران میں میرپور اور راجوری میں فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے اور عوام نے عدم ادائیگی مالیہ کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک میں جموں کے چند سیاسی لوگوں کا حصہ تھا۔ مگر چودھری غلام عباس کو یہ اصرار ہے کہ

"کوئی مانے یا نہ مانے مجھے پورا یقین ہے کہ عدم ادائے مالیہ کی تحریک ہری کشن کول کے ایما سے شروع ہوئی اور اس کے اپنے رشتہ دار اور پرائیویٹ سیکرٹری جیون لعل مٹو کا ہری کشن کول کی حیثیت سے اس

(کشمکش)

میں براہ راست دخل تھا"

میرپور میں گڑبڑ کے وقت سری نگر میں امن تھا اور حکومت کو اس بات کا احساس تھا کہ اس تحریک میں درپردہ شیخ عبداللہ کا ہاتھ ہے اس لئے انہوں نے جیل میں شیخ محمد عبداللہ سے رجوع کیا، تو انہوں نے کہہ دیا کہ میں تو ایک مدت سے جیل میں مقید ہوں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں"۔ اس کے بعد حکومت نے شیخ محمد عبداللہ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

اب اس سلسلے میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرپور کی تحریک واقعی ہری کشن کول کے ایماء پر شروع کی گئی تھی؟ اور کیا چودھری غلام عباس کا یہ الزام حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس معاملہ میں خود سردار گوہر رحمٰن کا بیان جو اس تحریک کے سربراہ تھے یہاں درج کیا جائے، جو انہوں نے راقم التحریر کو اس بارے میں دیا ہے تاکہ قارئین خود حالات کا اندازہ صحیح طریق سے کر لیں۔

سردار گوہر رحمٰن کا بیان ہے کہ "یہ تحریک نہ تو ہری کشن کول یا اس کے کسی ہمعصر کے کہنے پر شروع کی گئی اور نہ ہی اس کے داماد مسٹر جیون لعل مٹو کی انگیخت پر۔ یہ تحریک کشمیر سرکار کی سختیوں کے خلاف جاری کی گئی تھی۔ کیونکہ کشمیری عوام کے مطالبات کو منوانے کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا۔ اور بقول علامہ اقبال جب تک کشمیریوں کے ہاتھ میں تلوار نہیں ہو گی۔ وہ کبھی بھی اپنے حقوق تسلیم نہیں کروا سکیں گے سردار گوہر رحمٰن کا کہنا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اسی تحریک سے متاثر ہو کر حکومت نے ہمارے مطالبات کو تسلیم کیا اور کشمیر کے دیگر لیڈر جو حکومت سے مل کر کام کر رہے تھے۔ اس تحریک کو نقصان پہنچانے کے موجب بنے۔ ہری کرشن کول کے

بارے میں انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے یہ تحریک میرپور حکومت کے ایما پر شروع کی ہوتی تو مہاراجہ ہری کشن کول کو ریاست کی ملازمت سے جواب کیوں دیتا ؟ اس ضمن میں انہوں نے ایک یہ بات بتائی کہ ریاست کشمیر سے جانے کے کئی سال بعد جب ہری کشن کول سے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ریاست پٹیالہ میں ہوئی۔ تو انہوں نے کہا کہ سردار صاحب! میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ لوگوں نے میرے خلاف تحریک جاری کر کے مجھے ریاست سے نکلوا دیا۔ حالانکہ میری یہ دلی خواہش تھی کہ میں اپنے آبائی وطن کی خدمت کروں۔"

سردار گوہر رحمن کہتے ہیں کہ اگر میرپور میں تحریک جاری نہ کی جاتی تو حکومت کشمیر کبھی بھی مسٹر اے۔ آر۔ ساغر کو رہا نہ کرتی۔ جن کی سیاسی سرگرمیوں نے حکومت جموں و کشمیر کو سخت پریشان کر رکھا تھا۔ کیونکہ حکومت چاہتی تھی کہ مسٹر اے۔ آر۔ ساغر جیل ہی میں بند رہیں"۔

تحریکِ حریتِ کشمیر اور بیرونی معاونین

تحریکِ حرّیت کشمیر اور بیرونی معاونین

گزشتہ ابواب سے یہ صاف ظاہر ہے کہ "تحریکِ حریت کشمیر" ریاستی عوام کی اپنی خواہشات کا مظہر تھی۔ اور اس تحریک کو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقاء کار نے اپنی جدوجہد اور قربانیوں سے ابتدائی مراحل سے نکال کر ارتقاء کی راہوں پہ ڈالا۔ اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کو اپنے ہمسایہ ملک ہندوستان اور اب پاکستان کی بعض سیاسی جماعتوں اور حرّیت پسند افراد کا بھی تعاون حاصل تھا، مگر بعد میں ایک ایسا وقت آیا جب یہ تحریک دو یا تین حصّوں میں تقسیم ہو کر اپنے غیر ملکی معاونین کے زیرِ اثر پھیل گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریکِ حریتِ کشمیر گو اپنے مقصد سے ہٹی تو نہیں، مگر دور ضرور ہو گئی۔ یہ کیسے ہوا، اور اس کے اسباب کیا تھے، اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم ہر معاون جماعت کے مسلک اور اس کی عملی جدوجہد کا جائزہ لیں۔ تاکہ تحریک آزادیٔ کشمیر کے متعلق اس کے صحیح کردار کا پتہ چل سکے۔

جماعت احمدیہ کا مسلک۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے "جماعت احمدیہ" کی مساعی

کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔

جماعت احمدیہ "خطہ کشمیر کی آزادی" کے بارے میں کچھ مذہبی اعتقادات رکھتی ہے اور ان اعتقادات کی اساس وہ پیشگوئیاں ہیں، جو کشمیر کے بارے میں اُس کے امیر نے کی ہیں۔ چنانچہ جماعت احمدیہ کی ایک مشہور کتاب "المبشرات" کے صفحہ ۳۵۹ پر ایسی ہی ایک پیشگوئی کا ذکر ہے جو ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء کے "الفضل" کے صفحہ سات پر بھی شائع ہو چکی ہے)

"کشمیر کے مسلمان یقیناً غلام ہیں اور ان کی حالت دیکھنے کے بعد بھی جو یہ کہتا ہے۔ کہ ان کو کس قسم کے انسانی حقوق حاصل ہیں وہ یا تو پاگل ہے یا اول درجہ کا جھوٹا اور مکار۔ ان لوگوں کو خدا تعالیٰ نے بہترین دماغ دیئے ہیں اور ان کے ملک کو دنیا کی جنت بنایا ہے مگر ظالموں نے بہترین دماغوں کو جانوروں سے بدتر اور انسانی ہاتھوں نے اس بہشت کو دوزخ بنا دیا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی غیرت نہیں چاہتی کہ خوبصورت پھول کو کانٹا بنا دیا جائے، اس لئے وہ اب چاہتا ہے کہ جسے اس نے پھول بنایا ہے۔ وہ پھول ہی رہے اور کوئی ریاست اور حکومت اُسے کانٹا نہیں بنا سکتی۔ روپیہ۔ چالاکی مخفی تدبیریں اور پروپیگنڈا کسی ذریعہ سے بھی اسے کانٹا نہیں بنایا جا سکتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے۔ اس لئے کشمیر آزاد ہو گا۔ اور اس کے رہنے والوں کو ضرور ترقی کا موقعہ دیا جائے گا"

(المبشرات)

پھر دوسری جگہ مذکور ہے۔

"پہلی تحریک حریّت کشمیر کے متعلق رؤیا و کشوف"

(ب) "خطہ کشمیر جو اس وقت بین الاقوامی سیاست کی توجہ کا خصوصی مرکز بن چکا ہے، قدرت کی دلفریب رعنائیوں کے باعث فردوس ارضی کہلاتا ہے۔ لیکن مقام ازل کی بے پناہ فیاضی کے باوجود ایک لمبے عرصے سے انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جب ہندوستان پر برطانوی تسلط ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مخصوص سیاسی مصالحے کی بنا پر کشمیر کی حسین وادی کو ایک ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دی اور چالیس لاکھ نفوس بھیڑ بکریوں کی طرح غلام بننے پر مجبور ہو گئے۔ انسانیت کی اس شرمناک تجارت کی توثیق کے لئے ایک تحریری معاہدہ نامہ بھی ہوا۔ جسے "میثاق امرت سر" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت امام جماعت احمدیہ کو مظلوموں اور بیکسوں کے لئے ایک مضطرب اور حساس دل عطا فرمایا ہے حضور اوائل خلافت میں کئی بار کشمیر گئے اور ہر دفعہ کشمیریوں کی اندوہناک حالت پر افسردہ خاطر ہو کر لوٹے۔ حزن و غم کا یہ طوفان حضور کے دل و دماغ پر پوری طرح موجزن تھا۔ کہ اپریل ۱۹۳۱ء میں ریاستی جبر و تشدد کا ایک نہایت تاریک دور شروع ہوا۔ جبکہ کشمیر کے ڈوگرہ حکام نے ریاست کے بتیس لاکھ مسلمانوں کو بالکل بے دست و پا کر کے ان کے دین و مذہب میں

صریح مداخلت شروع کر دی۔ ڈوگرہ راج کی ان چیرہ دستیوں کا بے نقاب ہونا ہی تھا۔ کہ حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ العزیز جو پہلے ہی کشمیریوں کی غلامانہ کیفیت کو بدلنے اور اُن کو انسانی حقوق دلانے کا پختہ عزم کر چکے تھے اور مناسب موقعہ کی انتظار میں تھے۔ یکا یک میدان عمل میں آگئے اور مسلم زعماء کو ایک زوردار مضمون کے ذریعہ توجہ دلائی کہ وہ فوراً ایک کانفرنس بلا کر اس سوال پر غور کریں کہ کشمیر کے باشندوں کو جائز حقوق کیسے دلائے جا سکتے ہیں"۔

(ج) (انقلاب ۱۶ جون ۱۹۳۱ء۔ الفضل ۱۶ جون ۱۹۳۱ء)

کشمیر کمیٹی کا وجود

"اس مخلصانہ اپیل نے ملک کے طول و عرض میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ اور مسلمانوں کے مشہور لیڈر جن میں شاعر مشرق سر محمد اقبال، نواب صاحب کنج پورہ، سر ذوالفقار علی خاں۔ خان بہادر شیخ رحیم بخش ریٹائرڈ سیشن جج۔ سید محسن شاہ ایڈووکیٹ، خواجہ حسن نظامی، سید حبیب مدیر اخبار سیاست، مولانا حسرت موہانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں جمع ہوئے اور ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور علامہ اقبال کی تجویز پر آپ (بشیر الدین محمود) سے اس کی زمام قیادت ہاتھ میں لینے کی درخواست کی گئی جسے آپ نے (اس مخصوص روحانی مقام کے باوجود جو لاکھوں کی جماعت کے دینی پیشوا ہونے کی حیثیت سے آپ کو حاصل تھا) محض اسلامی اخوت کے تقاضوں کے پیش نظر قبول فرمایا"۔

"جس وقت آپ نے یہ کٹھن کام اپنے ذمہ لیا۔ اس وقت کشمیری باشندوں

کی حالت کس قدر درد انگیز تھی، اس کا نقشہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے اجلاس اول کی رُوداد میں بایں الفاظ کھینچا گیا۔

"ریاست میں اس وقت تک نہ پریس کی اجازت ہے نہ تقریر کی اور نہ اجتماع کی اور کوئی ایسی صورت نہیں کہ جس سے پُرامن طریق سے رعایا حکومت تک اپنے خیالات پہنچا سکے۔ اس طرح مذہبی آزادی جو کہ تہذیب کا پہلا رکن ہے اس سے بھی کشمیری محروم ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو جائے تو اس کی جائیداد ضبط کر لی جاتی ہے۔ اور بیوی بچوں سے اُسے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ نیز زمین کے مالکانہ حقوق سے بھی وہ لوگ محروم ہیں۔ کیونکہ زمینداروں کو خود اپنی زمین پر مالکانہ حقوق نہیں دیئے جاتے اور ریاست اپنے آپ کو پورے کشمیر کی زمین کی مالک سمجھتی ہے۔ اس طرح باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے مسلمانوں کو ملازمت میں نہایت ہی قلیل حصہ دیا جاتا ہے جو تین فیصدی ہے۔"

اس افسوسناک صورت حال کے مقابل (حکومت ہند ۱۹۴۷ء سے قبل کی حکومت ہند مراد ہے) ریاستی معاملات میں دخل دینے کے لئے تیار نہ تھی اور مہاراجہ کے مقرر کئے ہوئے ہندو آفیسر چھوٹے سے بڑے طبقہ تک ملک کی اکثریت کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اور خود ہندوستانی مسلمان ایک دوسری حکومت کے ماتحت اقلیت کی صورت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور بظاہر کامیابی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ اور مسلمان بے حد مایوس اور نا اُمید نظر آتے تھے۔ یہ وہ حالات تھے۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو متعدد رویاء کے ذریعہ سے متواتر خبر دی

کہ اس تحریک میں خدائی مشیت کام کر رہی ہے۔ اس لیئے ریاست کا تشدد، برطانوی حکومت کی بے نیازی اور ہندو سرمایہ کی فراوانی اس کے شاندار نتائج میں حائل نہیں ہو سکی"۔

(۵) ایک اور رویاء "غلام نبی گلکار کشمیر کی جماعت کے پریذیڈنٹ خواب میں سید ولی اللہ شاہ کی طرف سے ایک سفید تولیہ میں برف لاتے ہیں۔

(قدرتی برف سے یہ مراد ہے کہ یہ سامان تسکین کے غیب سے پیدا ہوں گے)

الفضل ۸؍ نومبر ۱۹۳۴ء

(س) علاوہ ازیں ان پیشگوئیوں کے، جماعت احمدیہ کے پیروکاروں کا اپنے ایک خاص عقیدہ کی وجہ سے بھی کشمیر سے ایک خصوصی لگاؤ ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بارے میں ہے۔ جماعت احمدیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کشمیر میں ہے۔ اور اس مسئلے میں جماعت احمدیہ کے دونوں فرقے متفق ہیں۔ اس سلسلے میں جماعت احمدیہ کی کتاب "مسیح ہندوستان میں" اور لاہوری پارٹی کے خواجہ کمال الدین صاحب کی کتاب (JESUS IN HEAVEN ON EARTH) میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس کے تذکرہ کا یہاں موقع نہیں۔

(ش) آئینی ذرائع کے اندر رہ کر جد و جہد کرنا (کسی حقوق کے لئے) جماعت احمدیہ کا نصب العین ہے۔ چنانچہ اس چیز کا اظہار احمدیہ جماعت نے یوں کیا ہے۔

"حکومت وقت کے قانون کی پابندی جماعت احمدیہ کے نزدیک اسلام کا اساسی عقیدہ ہے جس کی سختی سے پابندی کرنا ہر احمدی اپنا فرض

اولین سمجھتا ہے۔ (المبشرات صفحہ ۲۳۴)

"چنانچہ غیر آئینی ذرائع سے نہیں بلکہ ملکی اور ریاستی قوانین کی حدود میں رہتے ہوئے صرف چند سالوں میں ہی فضا یکسر بدل گئی۔ کشمیر میں مجوس انسانیت کو اکثر ابتدائی حقوق دیئے گئے۔ یعنی تعلیمی مراعات۔ فصلوں پر قبضہ اور اپنے تناسب کے مطابق ملازمتیں اور تقریر و تحریر میں آزادی وغیرہ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اسمبلی قائم ہوئی اور مسلمانوں کے لئے ریاستی سیاست میں حصہ لینے کی راہیں کھل گئیں۔

(صفحہ ۲۳۵)

(سلسلۂ احمدیہ حضرت مرزا بشیر احمد - ۴۹-۴۴ء)

خواجہ غلام نبی گلکار کے مذکورہ بالا رویاء کے بارے میں حسب ذیل واقعات تقسیم ہند کے بعد پیش آئے۔

۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو راولپنڈی میں خواجہ غلام نبی گلگار انور آزاد کشمیر حکومت کے پہلے صدر اور سردار ابراہیم خاں وزیر اعظم بنے۔ یہ دور حکومت جنوری ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔

اس سلسلہ میں مؤرخ کشمیر محمد اسد اللہ قریشی کاشمیری کا بیان ہے۔

"۴ اکتوبر کی حکومت قائم ہونے کے ساتھ ہی ۶ اکتوبر کو مجوزہ پروگرام کے مطابق خواجہ غلام نبی گلگار انور مظفر آباد سے مقبوضہ کشمیر میں چلے گئے۔ تاکہ وہاں بھی انڈر گراؤنڈ متوازی حکومت قائم کرکے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ کو گرفتار کیا جا سکے۔ جہاں آپ نے شیخ محمد عبداللہ

سے رازداری کے ساتھ ملاقات کی اور ان سے مل کر انڈر گراؤنڈ حکومت اور اس کے لئے رضا کاروں کی ایک فوج بنائی تھی۔ اس انڈر گراؤنڈ حکومت کے عہدہ دار مقبوضہ کشمیر میں جن میں سے ہر ایک کا مخفی نام تجویز کیا گیا تھا، حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسٹر علیم۔ وزیر تعلیم اصل نام ڈاکٹر نذیر اسلام
(۲) مسٹر لقمان۔ وزیر صحت " ڈاکٹر وزیر احمد قریشی
(۳) مسٹر فہیم وزیر زراعت " (اندرون کشمیر میں ہیں۔
(۴) عبدالرحیم درانی ڈیفنس سیکرٹری
(۵) مرزا شمس النہار گورنر کشمیر (مفتی غلام محمد صاحب اب فوت ہو چکے ہیں۔)
(۶) مسٹر انصاف۔ وزیر انصاف (اندرون کشمیر میں)
(۷) مسٹر رشیم الدین۔ ڈائرکٹر ریشم خانہ (اندرون کشمیر میں)
(۸) ڈاکٹر بشیر محمود مرحوم ڈائرکٹر میڈیکل سروسز
(۹) مسٹر انعام۔ خلیفہ عبدالمنان چیف انجنیئر
(۱۰) مسٹر حکیم صاحب انسپکٹر جنرل پولیس
(۱۱) مسٹر رحیم ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس جنرل محمد اکبر کیانی صاحب
(۱۲) مسٹر رحمت اللہ آف چراغدین ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس
(۱۳) منور چیف پبلسٹی آفیسر خواجہ غفار ڈار
(۱۴) سردار گل احمد خاں کوثر مرحوم چیف پبلسٹی آفیسر

مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب سے انٹرویو

امیر جماعت احمدیہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب نے راقم الحروف کو ایک انٹرویو میں ۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں فرمایا۔

(۱) "میرا مسئلہ کشمیر سے گہرا تعلق ہے اور اس سانحہ کا زخم ابھی تک میرے دل پر قائم ہے۔ میں ہر وقت کشمیریوں کی بے بسی پر خون کے آنسو روتا اور اللہ تعالیٰ سے اُن کی رستگاری کے لئے دعاگو ہوں۔

(۲) "شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ایک نہایت مومن انسان ہیں۔ انہوں نے کشمیریوں کے لئے بڑی جدوجہد کی ہے۔ ان کی کوششیں ضرور رنگ لائیں گی۔

(۳) "قیام پاکستان کے بعد جماعت احمدیہ نے کشمیر کی جنگ میں حصہ لیا اور "فرقان فورسز" محاذ پر بھی لڑتی رہیں جن کا شکریہ پاکستان کے کمانڈر انچیف نے بڑے اچھے الفاظ میں کیا۔

(۴) "اس وقت کی حکومت نے میرے مشوروں پر عمل نہیں کیا۔ اگر وہ میری بات مان لیتی تو صُورتِ حال یقیناً بدل جاتی۔

(۵) "گورنر پنجاب سرفرانسس موڈی نے مجھے کہا کہ تم ایک ایسا بیان دو جس کا مقصد یہ ہو کہ کشمیری عوام کے لیڈر چودھری غلام عباس ہیں"۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیونکہ میں اچھی طرح سمجھتا اور جانتا تھا کہ کشمیری عوام شیر کشمیر عبداللہ کے گرویدہ ہیں۔ اور اس قسم کے بیانات کی ضرورت نہیں۔

(۶) "میں نے چودھری محمد علی وزیر اعظم پاکستان کو گذشتہ دنوں چند مشورے دیئے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دسمبر

۱۹۵۵ء ہی میں آل پارٹیز کشمیر کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی۔

کشمیر اور — مجلس احرار اسلام

پاکستان کے سابق چیف جسٹس محمد منیر اپنی رپورٹ میں مجلس احرار اسلام کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"قوم پرست مسلمانوں کی ایک ٹولی نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر کے ۲۹ مئی ۱۹۳۱ء کو لاہور میں ایک جلسہ منعقد کیا اور "مجلس احرار اسلام" کی بنیاد رکھی۔ اور سب سے پہلے ۱۹۳۱ء کی تحریک کشمیر میں نمایاں ہوئے۔ اس سال ۲۰ اکتوبر کو مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایک سو رضا کاروں کا ایک جتھا سیالکوٹ سے جموں کے علاقے میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ پنجاب میں تحریک کشمیر اس لئے پیدا ہوئی کہ ڈوگرہ دربار نے کشمیری مسلمانوں کو انتہائی جبر و ظلم کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اور مسلمانان پنجاب کو ان سے گہری ہمدردی تھی کشمیری مسلمانوں کو شکایات یہ تھیں کہ ریاست نے متعدد مسجدوں، قبرستانوں اور دوسرے مقدس مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کو دفاتر میں ملازمت نہیں دی جاتی۔ ان کی مذہبی رسوم کی بجا آوری پر قیود عاید کی جاتی ہیں اور ریاست میں کوئی باقاعدہ اور آئینی قانون ساز مجلس موجود نہیں جس میں مسلمان ریاست کے اندر اپنے تناسب اعداد کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں جب اخباروں میں ان شکایات کے تدارک کے لئے مہم جاری کی گئی تو نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو سرینگر میں بلوہ ہو گیا۔ اس بلوہ میں جو شورش عام پیدا ہوئی اس کا چارج لینے کی کوششیں دو جماعتوں نے کی جن میں

ایک تو مجلس احرار تھی اور دوسری ایک اور انجمن موسومہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی جو ۲۶ جولائی کو وجود میں آئی اور جس میں ڈاکٹر سر اقبال، سر ذوالفقار علی، حسن نظامی، نواب ابراہیم علی خاں، مرزا بشیر الدین محمود شامل ہوئے اور ایک احمدی عبدالرحیم درد اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ چونکہ احرار اور احمدی شورش کشمیر کے دوران میں مخالف کیمپوں میں ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف ہو رہے تھے لہٰذا اس کے بعد بھی ان دونوں میں تصادم جاری رہا۔ احرار نے ۱۴ اگست کو یوم کشمیر منانے کا بندوبست کیا اور اس سے دوسرے دن انہوں نے کشمیری مسلمان بھائیوں کی حمایت میں تحریک کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ۲۰ اکتوبر کو مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایک سو رضاکاروں کا ایک دستہ علاقہ جموں میں داخل ہو گیا۔ اس ڈرامائی اقدام سے احرار کی حیثیت نمایاں ہو گئی (رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۰)

آغا شورش کاشمیری مدیر اعلیٰ "چٹان" لاہور کا خیال ہے۔

(ب) "کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے کوشش کی کہ وہ اپنے فرستادہ لوگوں کی معرفت کام لے چنانچہ ان عناصر نے علامہ اقبال کو لیپا پوتی کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ برطانوی سیاست کا سب سے کامیاب مہرہ مرزا بشیر الدین محمود اس کا صدر بن بیٹھا لیکن احرار نے راستہ روک لیا احرار کو اپنی علیحدہ جماعتی زندگی کی نیو اٹھانے کے لئے سیاسی میدان چاہیئے تھا۔ جو قدرت نے مہیا کر دیا"۔

علامہ اقبال نے ان کی استدعا پر کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ احرار اٹھے اور چھا گئے۔ انگریز نے بوجوہ چپ سادھ لی۔ احرار اشارہ پاتے ہی معاون بن بیٹھے۔ احرار نے غنیمت سمجھا اور ان سے دامے سخنے فائدہ اٹھایا۔" (عطاءاللہ بخاری از شورش کاشمیری)

آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں۔

(ج) "احرار" کانگرس کے دوش بدوش غیر ملکی حکومت سے لڑتے رہے بارہا اس سے آگے نکلنے کی کوشش بھی کی مگر ؎

سحر ہوئی تو گل و لالہ کا نشاں نہ رہا

تحریک کشمیر کی نیو اٹھائی اور چل دیے ؟

ابر کی برق باریاں نہ گئیں ؟

(د) "احرار مذہبی اعتبار سے فرقہ پرست فدائی اور سیاسی اعتبار سے انتہا پسند سیاسئین تھے۔" (جان گنتھر)

(س) "احرار ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی پہلی مسلم سوشلسٹ تحریک تھے"

(ولفریڈ سی سمتھ مصنف "ماڈرن اسلام ان انڈیا")

اس ضمن میں مدیر "انقلاب" مولانا عبدالمجید سالک فرماتے ہیں:

"مسلمانان کشمیر ڈوگرہ راج کے جبر و استبداد کے ماتحت انتہائی مصیبت ناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور پنجاب کے مسلمان ہی ان کی حمایت میں مصروف رہتے تھے۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کی انجمن کے ساتھ علامہ اقبال

کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے چلا آتا تھا۔ اور انگلستان سے واپس آکر
تو وہ انجمن "کشمیری مسلمانان" کے سیکرٹری مقرر ہو گئے تھے۔ سن ۱۹۳۱ء میں
بعض تازہ شکایات کی بنا پر آل انڈیا مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد
ہوا۔ جس میں کشمیر کے نظم و نسق پر نکتہ چینی کی گئی۔ "انقلاب" اخبار نے کشمیریوں
کے مصائب پر پے در پے مضامین شائع کئے اور بتایا کہ اس ریاست میں
مسلمان اکثریت آبادی ہونے کے باوجود پرلے درجے کے مظلوم ہیں۔
سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہیں۔ تعلیمی حالت سخت افسوسناک
ہے۔ مذہبی آزادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ بعض مساجد پر حکومت نے قبضہ
کر رکھا ہے گراں اور ناواجب ٹیکسوں کے بوجھ سے کشمیری مسلمانوں کی
کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ غرض کشمیری مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کر کے
مہاراجہ کشمیر سے استدعا کی جاتی تھی۔ کہ وہ اپنی مسلم رعایا کی طرف توجہ مبذول
کریں۔ اتنے میں ریاست کے وزراء نے "انقلاب" کا داخلہ ممنوع قرار
دے دیا۔ اور انقلاب نے اس کے جواب میں "کشمیری مسلمان" "مظلوم کشمیر"
اور "مکتوب کشمیر" کے نام سے پے در پے ہفتہ وار پرچے نکال کر ہزاروں کی تعداد
میں اندرون کشمیر بھیجنے شروع کر دیئے۔ اسی دوران میں متعدد اشتعال انگیز
واقعات کے باعث مسلمانانِ کشمیر میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا۔ گرفتاریاں،
مظاہرے، فائرنگ، تشدد، غرضیکہ قیامت برپا ہو گئی۔ پنجاب کے مسلمان سخت
مضطرب ہوئے۔ ایک طرف "مجلس احرار" نے داخلہ کشمیر کے امتناعی احکام
کی خلاف ورزی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور ہزارہا رضاکار

جیلوں میں چلے گئے۔ اور دوسری طرف مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ کی صدارت میں ایک کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ "آئینی ذرائع سے مسلمانان کشمیر کو ان کے حقوق دلوائے جائیں"۔ جو مسلمان کشمیر کی جیلوں میں محبوس تھے ان کی قانونی امداد کے لئے علامہ اقبال نے بعض نہایت معزز و مقتدر وکلاء کو کشمیر روانہ کیا۔

" علامہ کے نہایت مخلصانہ تعلقات نواب حمید اللہ خاں تاجدار بھوپال سے تھے اور تاجدار بھوپال مہاراجہ کشمیر کے دوست تھے علامہ نے ان کے ذریعے سے کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کشمیر نے کشمیریوں کے آئینی مطالبات کے سلسلے میں گلینسی کمشن مقرر کیا۔ اس وقت علامہ اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ مسلم کانفرنس کو گلینسی کمیشن کی ترتیب پر اعتراض تھا۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۲ء کے اجلاس عاملہ میں مسائل کشمیر کے متعلق ایک ضروری قرارداد منظور ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کمیشن کے ممبروں کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر نامزد کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ کمیشن ناقابل قبول ہے۔

"شیخ محمد عبداللہ اور قاضی گوہر رحمان کو جیل سے رہا کر کے موقع دیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات کمیشن کے سامنے پیش کریں۔ اس کے ساتھ ہی اسیران بلا کی تکالیف و مصائب اور مسلم وکلاء کے حدود ریاست سے اخراج کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا گیا۔"

علامہ اقبال کشمیر کمیٹی کے ذریعے سے بھی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے

پلیٹ فارم سے بھی مسلمانان کشمیر کے مسائل پر اظہار خیالات فرماتے رہے اور اسیران کشمیر کی رہائی پر اصرار کرتے رہے۔

کشمیر کمیٹی اب تک کسی دستور کی تدوین کے بغیر ہی کام کر رہی تھی اور صدر یعنی مرزا صاحب کو غیر محدود اختیارات دیئے گئے تھے لیکن جب تحریک کشمیر نے طول کھینچا۔ تو خیال پیدا ہوا کہ کشمیر کمیٹی کا ایک باضابطہ دستور تیار کیا جائے اس پر احمدیوں نے مخالفت کی۔ کیونکہ وہ اس ترتیب دستور کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ہم کو اور ہمارے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ اختلاف پیدا ہوا۔ مرزا بشیرالدین محمود نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور علامہ اقبال ان کی جگہ عارضی طور پر صدر منتخب ہوئے لیکن مرزا صاحب کے علیحدہ ہو جانے سے ان کے احباب و مریدین نے جو کمیٹی کے اصل کارکن تھے کشمیر کمیٹی کے کام میں دلچسپی لینا ترک کر دیا اور یہاں اور کوئی کارکن تھے ہی نہیں۔ لہٰذا علامہ نے بھی کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور کمیٹی ہی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گلینسی کمیشن کی سفارشات یہ تھیں کہ کشمیر میں پوری مذہبی آزادی ہو۔ عبادت گاہوں کو سرکاری قبضے سے نکال کر عوام کے سپرد کر دیا جائے۔ تعلیم عام کی جائے۔ ابتدائی مدرسے زیادہ تعداد میں کھولنے چاہئیں۔ مسلم مدرسین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص عہدہ دار قائم کیا جائے۔ عام ملازمتوں کا باقاعدہ اشتہار دیا جائے اور ہر فرقے کو مناسب حصہ دیا جائے ان سفارشوں پر عمل ہوا۔"

("ذکر اقبال" از سالک صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۴)

مولانا عبدالمجید سالک اپنی "سرگذشت" میں کشمیر کمیٹی کے حسرتناک انجام کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔

"احرار نے احمدیوں کے خلاف بلا ضرورت ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ اور کشمیر کی تحریک میں مختلف عناصر کی ہم مقصدی و ہم کاری کی وجہ سے جو قوت پیدا ہو چکی تھی۔ اس میں رخنے پڑ گئے تو مرزا بشیرالدین محمود نے کشمیر کمیٹی سے استعفٰے دے دیا۔ اور ڈاکٹر اقبال اس کے صدر مقرر ہوئے کمیٹی کے بعض ممبروں اور کارکنوں نے احمدیوں کی مخالفت اس لئے شروع کر دی کہ وہ احمدی ہیں۔ یہ صورت حال مقاصد کشمیر کے اعتبار سے سخت نقصان دہ تھی چنانچہ ہم نے کشمیر کمیٹی کے ساتھ ہی ساتھ ایک کشمیر ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جس میں سالک۔ مہر۔ سید حبیب۔ ق ق۔ مرزا بشیرالدین محمود اور ان کے احمدی اور غیر احمدی رفقاء سب شامل تھے ایسوسی ایشن کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مبادا کشمیر کمیٹی آگے چل کر احرار ہی کی ایک شاخ بن جائے اور وہ متانت و سنجیدگی رفو چکر ہو جائے جس سے ہم اب تک کشمیر میں کام لیتے رہے ہیں بہرحال تھوڑا بہت کام ہوتا رہا لیکن کچھ مدت بعد نہ کمیٹی رہی۔ نہ ایسوسی ایشن رہے نام اللہ کا۔"

(سرگذشت صفحہ ۳۳۸)

مجلس احرار اسلام کی کشمیر تحریک کے بارے میں چودھری غلام عباس کا یہ بیان ہے۔

"میری غیر حاضری میں مسلم ایسوسی ایشن کا کام ساغر صاحب کے

ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے جماعت احرار کی تحریک کے ردّ عمل کے لئے انفرادی سول نافرمانی کی اور پچاس کے قریب نوجوانوں کے ہمراہ قید ہو گئے۔"

"چند نوجوان احرار کے حامی تھے انہوں نے مسلم ایسوسی ایشن پر دباؤ ڈالا کہ ریاست کے مسلمان احرار کی رفاقت سے کام کریں۔ جماعت احرار کے لیڈروں اور بزرگوں سے جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کو شدید اختلافات تھے۔ یہ تحریک انہوں نے ہماری شدید مخالفت کے باوجود ایسے حالات میں شروع کی جو اسلامیان ریاست کی اس وقت کی سیاسی فضا کے لئے سازگار نہ تھی۔ کمیشن کے فیصلے کی طرف ہندوستان اور ریاست کے مسلمانوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور ہر معقول آدمی اس وقت کسی غیر آئینی کاروائی کو مفادِ ملت کے خلاف ایک تخریبی حرکت تصور کرتا تھا۔"

(کشمکش صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸)

بہتر یہی ہو گا اگر احرار تحریک کے انجام کے بارے میں آغا شورشؔ کاشمیری کے بیان کو درج کیا جائے۔

لکھتے ہیں:

"حکام ریاست نے پہلے تو احرار کو نظر انداز کیا پھر ترغیب و تحریص کا دام بچھایا۔ جب یہ دونوں داؤں ناکام ہو گئے تو اندرون ریاست کے راہنماؤں سے سمجھوتہ کر کے سہ طرفہ حملہ شروع کر دیا۔

(۱) ریاستی راہنماؤں کو نہ صرف احرار کی ہم نوائی سے روک دیا گیا بلکہ ان سے کنارہ کشی کا اعلان کر ڈالا۔

(ب) ریاست کے باہر پوری ہندو قوم کو بلا تفریق عقیدہ و خیال مخالف بنا دیا گیا حتیٰ کہ مہاتما گاندھی کو بھی گول میز کانفرنس لندن میں اعلان کرنا پڑا کہ تحریک کشمیر سے انگریز کو تقویت پہنچنے کا امکان ہے۔"

(ج) ریاست کے اندرونی رہنماؤں بالخصوص شیخ محمد عبداللہ نے کئی اسباب کی بنا پر احرار سے گریز کیا۔"

(عطاء اللہ بخاری از شورش کاشمیری صفحہ ۸۶)

ماحصل بحث "آل انڈیا کشمیر کمیٹی" اور "مجلس احرار اسلام" کے باہمی اختلافات کا اندرونِ ریاست بہت بُرا اثر پڑا۔ اور جو اتحاد ریاست جموں و کشمیر کے لیڈروں میں "تحریک آزادی کشمیر" کے لئے پیدا ہو چکا تھا، وہ پارہ پارہ ہونے لگا۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے اول غلطی چودھری غلام عباس نے کی۔ اگر وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس جس کے صدر علامہ اقبال تھے کی قرارداد پر عمل کرتے ہوئے اسی وقت گلینسی کمیشن سے مستعفیٰ ہو جاتے تو حکومت کشمیر غلامی کی زنجیروں کو اتنا طویل نہ کر سکتی۔

(۲) کشمیری عوام نے گلینسی کمیشن سے بائیکاٹ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ کمیشن کے اراکین پر اُن کو اعتماد نہیں ہے۔

(۳) جموں مسلم ایسوسی ایشن جس کے کرتا دھرتا بقول چودھری غلام عباس وہ خود ہی تھے۔ اگر صحیح معنوں میں منظم ہوتی تو کبھی بھی مسٹر اے۔ آر۔ ساغر تحریک احرار میں شرکت نہ کرتے۔

(۴) مجلس احرار اسلام نے ریاست میں اپنی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے کشمیری لیڈروں کو آپس میں الجھا دیا اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے خلاف یہ الزام تراشیاں شروع کرا دیں کہ وہ "مرزائی" ہیں۔

اور بقول مولانا عبدالمجید سالک

میر واعظ محمد یوسف شاہ جو خاندانی اعتبار سے "تعاونی" تھے۔ اس لئے شیخ محمد عبداللہ اور اُن کے رفقاء کار کی مخالفت میں نہایت سرگرم تھے! اور اب شیخ صاحب کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ دیتے تھے۔ کہ وہ کشمیر کمیٹی کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔ جس کا صدر مرزائی جماعت کا امام تھا اور شیخ عبداللہ خود بھی دل سے مرزائی ہے"۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ شیخ محمد عبداللہ عقیدہ کی رُو سے نہ تو مرزائی تھے اور نہ ہی فرقہ پرستی کے قائل ؟

اس بارے میں مصنف "ذکر اقبال" لکھتے ہیں:

"شیخ محمد عبداللہ (شیر کشمیر) اور دوسرے کارکنان کشمیر مرزا محمود احمد صاحب اور ان کے بعض کارپردازان کے ساتھ خفیہ نہیں بلکہ اعلانیہ روابط رکھتے تھے۔ اور ان روابط کا کوئی تعلق عقائد احمدیت سے نہ تھا۔ بلکہ ان کی بنا محض یہ تھی کہ مرزا صاحب کثیر الوسائل ہونے کی وجہ سے تحریک کشمیر کی امداد کئی پہلوؤں سے کر رہے تھے اور کارکنان کشمیر طبعاً ان کے ممنون تھے"

(ذکر اقبال صفحہ ۱۸۸)

اور حقیقت حال یہ تھی کہ

خود میر واعظ محمد یوسف شاہ حکومت سے تعاون کر رہے تھے اور بقول مولانا ظفر علیخاں مرحوم ؎

میں نے یوسف شاہ سے پوچھا کہ بیعت آجکل
آپ کو کشمیر کے پیروں میں کن صاحب سے ہے
ہنس کے بولے قادیاں سے ہو چکا ہوں بدگماں
اس لئے مجھ کو عقیدت کالون[1] صاحب سے ہے

مجلس احرار اسلام کی طرح جماعت احمدیہ نے بھی کشمیر کی سیاست کے کچھ سرگرم کارکنوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور وہ کارکن جماعت احمدیہ کے اشاروں پہ کام کرنے لگے جن میں غلام نبی گلکار گروپ قابل ذکر ہے۔ اس کو "تحریک حریت کشمیر" میں بہت گہرا دخل حاصل تھا۔

اب ہمارے سامنے سیاسیات کشمیر کے جو خارجی اور داخلی رُخ آئے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

بیرون ریاست:۔

(۱) جماعت احمدیہ کشمیری مسلمانوں کی مدد کرنا اپنا ایک مذہبی فریضہ سمجھتی تھی۔

---

[1] کالون صاحب سے مراد لفٹیننٹ کرنل کالون سے ہے۔ جو انڈین پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھے اور ۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک کشمیر کے چیف منسٹر رہے۔

(۲) علامہ اقبال مرحوم ہر ممکن طریق سے کشمیری عوام کی بہتری کے لئے کوشاں اور کشمیر کمیٹی کے سرگرم لیڈروں میں سے ایک تھے۔

کشمیر کمیٹی آئینی طریق سے کشمیری عوام کی سہولتوں کے لئے جد وجہد کر رہی تھی

(۳) "مجلس احرار اسلام" کانگرس سے علیحدہ ہو کر اپنی سیاسی حیثیت قائم کرنے میں کوشاں تھی اور اس نے پنجاب اور کشمیر دونوں خطوں میں "احمدیوں" کے خلاف محاذ جاری کر دیا تھا، جس سے احمدی کارکن بددل ہو گئے تھے۔

اندرون ریاست:-

(۱) شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد سب لیڈر اقتدار کے لئے آپس میں الجھ پڑے۔ اس دور میں جنگ قیادت شروع ہو گئی۔

(۲) مسلم ایسوسی ایشن دو حصوں میں منقسم ہو گئی، اور صوبہ کشمیر میں میرواعظ کشمیر نے ڈوگرہ حکومت سے تعاون بھی کر لیا۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود شیخ محمد عبداللہ نے اپنا مشن جاری رکھا اور شب و روز کی محنت سے بگڑے ہوئے حالات کو نہ صرف سنوارنے کی کوشش کی بلکہ حکیم الامت علامہ اقبال کی طرف رجوع کیا اور انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی۔ تاکہ وہ خود آکر کشمیری لیڈروں پر حقیقت حال بھی واضح کریں اور انھیں ایک پرچم تلے جمع ہونے کے لئے بھی کہیں۔ ان کے خط کے جواب میں علامہ مرحوم نے یہ جواب دیا۔ جو اگلے صفحہ پہ درج ہے۔

لاہور

۱۲؍ اکتوبر ۱۹۳۳ء

ڈیر شیخ عبداللہ صاحب۔ السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کشمیر کی خبریں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی مجھے یقین ہے کہ بزرگان کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ اس بات کے لئے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بار آور کرے گا۔ لیکن سنا ہے مختلف جماعتیں بن گئی ہیں۔ اور ان کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہے بلکہ اس وقت ہیں۔ بہرحال دعا ہے کہ آپ کو یہ تجربہ نہ ہو۔ افسوس ہے کہ میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

محمد اقبال۔ لاہور

ان حالات کی روشنی میں یہ کہنا کہ علامہ اقبال کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے یا کسی کے کہنے پر تحریک کشمیر کی حمایت سے دست بردار ہو گئے تھے صریحاً غلط اور حقائق سے روگردانی ہے بلکہ مولانا عبدالمجید سالک کا یہ کہنا درست ہے کہ جماعت احمدیہ کی وجہ سے کمیٹی میں کارکنان کا فقدان ہو گیا اور کمیٹی میں وہ زندگی

نہ رہی جو قبل پائی جاتی تھی۔

الغرض بد قسمتی یہ ہوئی کہ احرار نے تحریک حریت کشمیر کو اپنی جماعت کی "رونق بازار" کا ذریعہ بنایا اور جماعت احمدیہ نے اُسے اپنی فرقہ وارانہ توسیع کا آلۂ کار اور تحریک کشمیر کو صرف اپنی ہی مساعی سے چلانے کا منصوبہ بنایا اور بعد کے واقعات سے جماعت احمدیہ کے مخصوص عزائم کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جب خواجہ غلام نبی گلکار نے کشمیر کی انڈر گراؤنڈ حکومت بنائی، (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) تو اس کی کابینہ کے اراکین کی اکثریت جماعت احمدیہ کے عقائد سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتی تھی۔ اور اس وقت اس تحریک کی سرپرستی خود مرزا بشیر الدین محمود کر رہے تھے۔ اور محاذ کشمیر پر بھی احمدیوں کا ایک فوجی دستہ فرقان بٹالین موجود تھا۔

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ صدارتی انتخاب کے موقع پر مسٹر کے۔ ایچ خورشید کے مقابلے جماعت احمدیہ نے خواجہ غلام نبی گلکار کی کیوں حمایت نہ کی اور خاموش رہی۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ "فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت" میں جماعت احمدیہ کا موقف یہ تھا کہ احمدیوں کا مقصدِ حیات مذہبی یعنی تبلیغِ دین اور اس کے پیشِ نظر کوئی سیاسی مقصد نہیں اور نہ ہی کسی صوبہ کو احمدیہ صوبہ بنانے کا شوق ہے"۔ اور اگر وہ اس "سیاسی الیکشن" میں حصہ لے لیتے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے دیگر ساتھیوں کا اُن پر یہ الزام درست ثابت ہو جاتا تھا کہ احمدی مذہبی سرگرمیوں کی بنا پر سیاسی غلبہ چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جماعت احمدیہ نے خواجہ غلام نبی گلکار کی حمایت نہ کی۔

اس سے بالکل یہ واضح طور سے ثابت ہوگیا کہ جماعت احمدیہ اپنی کسی بھی سرگرمی کو اُن جماعتوں کی تابع نہیں بناتی جن پر اُس کا اپنا دخل یا اثر نفوذ نہ ہو۔ تحریک کشمیر کے ابتدائی مراحل میں کشمیر کمیٹی کے دستور بنانے پر احمدی اس سے علیحدہ ہوگئے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خواجہ غلام نبی گلکار نے جو وزارت قائم کی۔ اس میں بھی صرف احمدیہ حضرات ہی کو اعتماد میں لیا۔ اور جب انہوں نے اپنا موقف بدلا تو خواجہ غلام نبی گلکار کی حمایت تک نہ کی۔

مختصراً کشمیر کی تحریک کے اندرون ریاست اور بیرون ریاست کے معاونین ذہنی الجھنوں اور داخلی گتھیوں میں اُلجھے، اور اس سے تحریک حریت کشمیر بھی بُری طرح متاثر ہوئی اور وہ کچھ حاصل نہ کر سکی جس کی آرزو لے کر یہ چلی تھی !!!

"کشمیر چھوڑ دو"

"کشمیر چھوڑ دو"

شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت و سیاست ہمیشہ سے بڑے شدید جذبات کی ترجمان رہی ہے۔ اور وہ سیاسی مسائل کے متعلق اپنے محسوسات جس طرح پیش کرتے ہیں اس سے اُن کے بعض ناقدین اور ہمعصر سیاستین نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان کی سیاست میں فکر اور گہرائی زیادہ نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنے سیاسی طریقہ کار میں تدبر سے زیادہ کام نہیں لیتے۔ قبل اس کے کہ ناقدین کے ان اعتراضات کا جواب دیا جائے، بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس سلسلے میں "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کے تاریخی پس منظر پر نظر دوڑائیں۔ اس سے ہمیں پتہ چل جائے گا کہ شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی طریق کار میں فکری عنصر کہاں تک ہے؟ اور یہ تجزیہ اس لحاظ سے بھی مفید ہوگا کہ اس سے شیخ محمد عبداللہ کے سیاسی کردار کی رفعتوں کے وجوہ کی داستان نکھر کر سامنے آجائے گی اور ناقدین کو بھی اپنے اعتراضات کا جواب مل جائے گا؟

سیاست میں فکری عنصر کا دخل کہاں تک ہوتا ہے۔ اس اصولی بحث کا یہ موقعہ نہیں مگر یہ بات ضرور ہے کہ سیاست کی اساس کسی سیاسی نظریہ یا کسی فکر یا تخیل پر ضرور بالضرور ہونی چاہیئے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی نصب العین ریاست جموں و کشمیر کی مکمل آزادی ہے اور اس منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے جو راہیں اختیار کیں، وہ سب اُن کے نصب العین سے شدید وابستگی کے جذبے کا مظہر ہیں۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے اس نصب العین کے حصول کے لئے "وقتاً فوقتاً" جو بھی تحریکیں شروع کیں۔ وہ اُن حالات و واقعات کے مطابق تھیں، جن سے فرزندان کشمیر کو دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ یہ شیر کشمیر ہی کی مسلسل جد و جہد کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آتی گئی کشمیری عوام کی ذہنی و عملی قوتیں بیدار ہوتی گئیں۔

وہ اپنی سرزمین کی آزادی کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانیاں دینے لگے۔ ذیل میں "تحریک کشمیر چھوڑ دو" کی روئداد درج کی جا رہی ہے جو نہ صرف یہ کہ عوام کے لئے ایک حرکت آفرین نعرے کی تمہید بن گئی، بلکہ وہ اُن میں پہلا فکری و عملی انقلاب لانے کا باعث بنی اور اس کی بدولت کشمیری عوام میں یہ جرأت پیدا ہوئی کہ وہ ذمہ دار نظام حکومت کے مقابلہ سے بڑھ کر مہاراجہ کشمیر کو صاف طور پر للکاریں کہ "کشمیر چھوڑ دو"، "کشمیر کو خالی کر دو" اور کشمیری عوام ڈوگرہ شاہی کو اب برداشت کرنے کو تیار نہیں

گو اس تحریک "کشمیر چھوڑ دو" کے بارے میں چودھری غلام عباس کا یہ خیال ہے کہ

"یہ شیخ عبداللہ کے کمیونسٹ دوست مسٹر بیدی، ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا تراشا ہوا منصوبہ تھا۔"

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس تحریک کے بارے میں خود مہاراجہ ہری سنگھ کا بھی

یہ خیال تھا کہ یہ تحریک شیخ محمد عبداللہ نے جو کہ کمیونسٹ ہے، حکومت کے خلاف شروع کی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے ایک دوست وکٹر کو خط لکھا تھا جس کا متن یہ ہے:۔

میرے پیارے وکٹر!

اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اخبارات میں کشمیر میں گڑبڑ سے متعلق خبریں پڑھی ہوں گی، لیکن یہ گڑبڑ اتنی زیادہ نہیں ہے جتنا متعلقہ پارٹیاں اُسے اخبارات میں اُچھال رہی ہیں۔

یہ گڑبڑ ایک مقامی سرغنہ عبداللہ کی انگیخت پر جو کہ ایک کمیونسٹ اور وطن دشمن ہے۔ شروع ہوئی اور اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ جو حکومت میں وزیر مقرر کیا گیا تھا، حکومت کی پالیسی کی راہ میں نہ صرف رکاوٹیں ڈلوائیں بلکہ حکومت کے باہر عوام میں حکومت کے خلاف زبردست "غیر ذمہ دارانہ" تقاریر بھی کیں۔

قدرتی طور پر میری حکومت کو حفاظتی تدابیر اختیار کرنی تھیں۔ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے وقت عبداللہ اپنے گواہ جواہر لعل نہرو سے ملنے جا رہا تھا۔ اسی بنا پر نہرو کو دکھ ہوا کہ اُس کا ایک لفٹیننٹ اس وقت پکڑا ہے جب وہ اُسے ملنے آ رہا تھا۔ اس بات پر نہرو نے حالات سے بے خبر ہو کر تمام حدوں سے تجاوز کر لیا۔

عبداللہ کی گرفتاری کے دو تین دن بعد ہی سارے حالات اعتدال پر آ گئے۔ لیکن شہر کے ایک حصہ کی جو تیسرے اور چوتھے پل کے درمیان ہے، ایک مسجد کو ایک سیاسی پلیٹ فارم کی شکل دے دی گئی ہے، جس

میں ہر روز دو تین ہزار آدمی جن میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ عبادت کے پردے میں حملہ کر کے حکومت کے خلاف نعرے لگاتے اور تقاریر کرتے ہیں۔ مگر ہم نے بھی اپنے آپ کو مضبوط کر لیا ہے۔

یہ تحریک بڑی خطرناک تھی۔ درحقیقت جواہر لعل کی حمایت ہمارے لئے دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ وہ ہر وقت حکومت کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کرتا رہتا ہے۔ مگر ہم یہ حالت بدل دیں گے۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور کیا کہتا ہے۔ یہ مقدمہ تمام ریاستوں کے لئے ٹسٹ ہے۔

میں تمہیں یہ خط رنگون کے پتہ پر ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے لکھو تم کب تک برما میں قیام کا ارادہ رکھتے ہو۔ ہم گرمیوں کی تعطیلات میں شیر کی توقع کر رہے ہیں۔

تمہارا مخلص

ہری سنگھ

شیخ محمد عبداللہ کی اس تحریک "کشمیر چھوڑ دو" کی صدائے بازگشت صرف ریاست جموں و کشمیر کی حدود تک نہ رہی بلکہ اس وقت پورے برِ صغیر کی فضا اس سے گونج اٹھی شیخ صاحب نے ڈوگرہ عدالت کے سامنے اس تحریک کو شروع کرنے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے جو تاریخی بیان دیا تھا برِ صغیر کے بعض اخبارات نے اس پر جو تبصرے کئے تھے۔ ان کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:-

نوائے وقت لاہور

"شیخ صاحب (محمد عبداللہ) نے ان الزامات کی تردید کی کہ "کشمیر چھوڑ دو"

کی تحریک اور معاہدہ امرت سر کی تنسیخ کا مطالبہ فرقہ دارانہ یا اشتراکی رجحانات کا مظہر تھا۔" شیخ صاحب نے کہا کہ وادئ کشمیر پر قدرت نے اپنے لطف وکرم کی فراوانی کر رکھی ہے لیکن اس کے ساتھ کشمیری عوام کی غربت اور ان کے مصائب ہر ذی حس انسان کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔

۴ر اگست ۱۹۴۶ء

"پربھات" لاہور۔

اپنی صفائی میں جو بیان شیخ صاحب نے عدالت کے سامنے دیا، وہ ہندوستان کی ریاستوں کی عوامی تحریک میں ایک نہ مٹنے والا ریکارڈ ہے پوری دلیلوں تاریخی حوالوں اور سچے واقعات کی روشنی میں شیخ صاحب نے ثابت کر دیا ہے کہ ریاستوں کے عوام کو بیدار کرنا اور نوکر شاہی کے پنجوں سے انہیں رہا کرا کے طرزِ حکومت میں شریک کرنا کوئی جرم نہیں اور اگر شیخ عبداللہ نے اپنی ریاست کے غریب اور بے بس عوام کو اٹھانے کا کام کیا ہے تو وہ اس قابل ہیں کہ لوگ ان کی پرستش کریں۔"

(۶ر اگست ۱۹۴۶ء)

"شہباز" لاہور

"شیخ صاحب نے فرمایا ہے اور بالکل بجا فرمایا ہے کہ میرے خلاف جو مقدمہ دائر کیا گیا ہے وہ دراصل تمام کشمیری عوام کے خلاف ہے یعنی ایک طرف حکومت کے چند افراد ہیں اور دوسری طرف چالیس لاکھ انسانوں کا پورا جم غفیر، پھر کیا کوئی ایسی حکومت جس کے خلاف پوری رعایا صف آرا ہو

جمہوریت اور دستوریت پسندی کے موجودہ عہد میں حکومت کرنے کے قابل سمجھی جا سکتی ہے۔"

۸ راگست ۱۹۴۶ء

نظام بمبئی

"شیخ محمد عبداللہ نے ذمہ دار نظام حکومت کی تشریح "کشمیر چھوڑ دو" کے نعرے سے کر کے ریاستی عوام کے حقیقی مطالبے اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ٹھان لی ہے۔ کشمیری عوام کا یہ نعرہ صرف غاصب مہاراجہ کشمیر اور صرف ڈوگرہ شاہی راج کے خلاف ایک "اعلان جنگ" نہیں ہے بلکہ یہ تمام ریاستی عوام کی حقیقی آواز ہے۔ ہندوستان کے چالیس کروڑ مظلوموں۔ غلاموں اور فاقہ کشوں کی مؤثر ترجمانی ہے۔"

۱۸ راگست ۱۹۴۶ء

کیا اس کے بعد یہ بات پوری طرح عیاں نہیں ہو جاتی کہ چودھری غلام عباس نے اس تحریک کو کمیونسٹ کہہ کر اس وقت کشمیر سرکار کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی اور انہوں نے بلا وجہ ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر کی کوششوں کو ہدفِ تنقید بنایا تھا حالانکہ حقیقی واقعات یہ ہیں۔

"پاکستان قائم ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر تاثیر مرحوم کمیونزم اور ترقی پسند ادب کی لیڈری سے برگشتہ ہو چکے تھے۔ اور اپنے بعض احباب مخلص کے ساتھ مل کر بعض خدماتِ قومی بھی انجام دے رہے تھے۔ مثلاً انہوں نے شیخ محمد عبداللہ (قائد کشمیر) اور قائد اعظمؒ کی ملاقات کرانے کے لئے بے حد محنت کی

اور فریقین کو آمادہ کر لیا، لیکن آخر میں دونوں نے بعض اصولوں کے پیش نظر ملاقات سے پہلو تہی کر کے تاثیر کو سخت مایوس کر دیا۔ کشمیر کے لیڈروں کے ساتھ تاثیر کے گہرے تعلقات تھے"۔

(عب الوطن تاثیر" یارانِ کہن" از عبدالمجید سالک صفحہ ۲۲۹

چونکہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے تعلقات کشمیر کی ادبی و علمی شخصیتوں سے تھے۔ اور اس زمرے میں چودھری غلام عباس شریک نہ تھے۔ اس لئے چودھری غلام عباس نے خواہ مخواہ ڈاکٹر تاثیر کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ اور تحریک "کشمیر چھوڑ دو" کے منصوبہ کو "کمیونسٹ تصور" کا رنگ دے دیا۔ حالانکہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے صاف طور پر کہا تھا کہ یہ تحریک کسی کی انگیخت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ کشمیری عوام کی دلی آرزوؤں کی ترجمان ہے"۔

بہرحال یہ تحریک تمام ریاست جموں و کشمیر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی گو چودھری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ مشترکہ اتحاد نے اس تحریک کو کچلنا چاہا، لیکن بپھرے ہوئے عوام کے جذبات کے آگے یہ "اتحاد" پارہ پارہ ہو گیا۔ اور بالآخر چودھری غلام عباس بھی "ڈائرکٹ ایکشن" کا لبادہ اوڑھ کر "میدان عمل" میں کود پڑے۔ کیونکہ ان حالات میں جب پنجاب پریس اور مسلم لیگی اخبارات نے شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ تو چودھری غلام عباس کے سامنے صرف یہی ایک راستہ رہ گیا تھا یعنی مرزا غالب کے الفاظ میں

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کیبنٹ مشن کی آمد

۱۹۴۶ء میں جب برطانوی کیبنٹ مشن دہلی میں ہندوستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مذاکرات کے لئے آیا تو شیخ محمد عبداللہ نے یہ دیکھا کہ سرکاری حکومت کے جو مذاکرات ہندوستانی لیڈروں سے ہو رہے ہیں، اُن میں ریاستی عوام کی آزادی کا ذکر نہیں ہے۔ اس چیز کو مدِنظر رکھتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمقام جموں میں بلایا۔ جس میں وائسرائے ہند کی تقریر جو کہ انہوں نے ۱۷ر جنوری ۱۹۴۶ء کو ایوانِ والیانِ ریاست ہند میں کی تھی۔ زیرِ بحث آئی۔ اور مسلسل تین روز کے غور و فکر کے بعد ایک ریزولیوشن پاس ہوا۔ جس کا متن یہ تھا۔

"یہ معاہدات اور فیصلہ جات جو بوسیدہ رجعت پرستانہ اور قابلِ اعتراض ہیں، ہمیشہ ریاستی عوام کی ترقی میں حائل رہے ہیں، اور رہیں گے اس قسم کا خیال کہ والیانِ ریاست اپنی اپنی مخصوص حیثیتوں کو محض اپنی مرضی سے چھوڑ دیں گے ایک خوش فہمی ہے۔ نیشنل کانفرنس نے کئی موقعوں پر اس امر کو بالکل واضح کیا ہے۔ کہ یہ معاہدات ایسے اوقات، و حالات میں جو آج موجود نہیں ہیں، اور ریاستی عوام کی مرضی معلوم کئے بغیر کئے گئے ہیں۔ آج کے حالات میں کسی قسم کا کوئی معاہدہ یا فیصلہ جو برطانوی ہندوستان میں رہنے والے لوگوں اور ریاست میں رہنے والے عوام کی ترقی میں دیوار بن کر حائل ہو۔ لوگوں پر کسی بھی صورت میں قابلِ پابندی نہیں ہو سکتا۔"

وزارتی مشن کو تار

نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ریزولیوشن کے بعد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے وزارتی مشن کو ایک تار میں ریاست جموں و

کشمیر کے حالات سے باخبر کرتے ہوئے لکھا ——

"بحیثیت صدر آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس جو ریاست میں بسنے والے لوگوں کے تمام طبقوں اور فرقوں کی نمائندگی کرتی ہے، میں ریاست میں آپ کی آمد پر آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ چالیس لاکھ باشندگان ریاست کے لئے ایک نئے سیاسی اور اقتصادی دور آزادی کا پیش خیمہ ہوگا۔ اس امر کے پیش نظر کہ وزارتی مشن اس وقت ہندوستانی ریاستوں کے والیوں اور اقتدار اعلیٰ کے درمیان تعلقات بر بنائے معاہدات پر نظر ثانی کر رہا ہے، ہماری خواہش یہ ہے کہ اس رشتے کی جانچ پڑتال کرنا کشمیریوں کے سلسلہ میں نہایت ناگزیر ہے کیونکہ آج سے ایک سو برس پہلے ۱۸۴۶ء میں کشمیر کی ساری سرزمین اور اس کے لوگ ڈوگرہ خاندان کی غلامی میں انگریزوں نے ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپیہ کے عوض بیچ دیئے تھے اُس وقت کے گورنر کشمیر نے اس انتقال کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر اُسے انگریزوں کی مدد سے زیر کر لیا گیا۔ اس طرح ۱۸۴۶ء کے بیعنامہ نے جس کو معاہدہ امرتسر کا غلط نام دیا گیا ہے، کشمیر کے عوام کی قسمتوں پر ایک مہر لگا دی۔ ہم دنیا کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ بیعنامہ اس قسم کے حقوق اور مراعات کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ جو ان ریاستوں کو حاصل ہیں، جن کے ساتھ معاہدے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں کشمیر کا معاملہ بالکل جدا حیثیت رکھتا ہے۔ اور کشمیر کے لوگ برطانیہ کے ہندوستان سے چلے جانے پر اپنے قابل انکار مطالبہ آزادی پر زور ڈالتے ہیں۔ ہم اس امر کا بھی اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی معاہدہ خواہ وہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو، چالیس لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں

کو ایک مطلق العنان انسان کے حوالے نہیں کر سکتا۔ جبکہ ایسی حکومت کے تحت رہنے کی خواہش ہی اُن میں نہ ہو کشمیر کے عوام نے ارادہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی قسمت آپ بنائیں گے اور ہم مشن سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مطالبات کی قوت اور جواز کو تسلیم کرے ؎

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس تار کے بعد انہوں نے ایک یادداشت کی صورت میں کشمیر کی تمام سیاسی و اقتصادی حالت کو برطانوی مشن کے سامنے یوں پیش کیا۔

تاریخی یادداشت

آج کشمیر کے عوام کا مطالبہ محض ذمہ دار حکومت کا قیام ہی نہیں بلکہ ڈوگرہ خاندان کی مطلق العنان حکومت سے کامل آزادی حاصل کرنا ہے تقریباً ایک سو برس ہوئے کہ کشمیر کے عوام ایسٹ انڈیا کمپنی کے حریص ایجنٹوں کے سودے کا شکار ہو گئے۔ سکھ ٹکسال کی ۷۵ لاکھ روپیہ کی حقیر رقم کے عوض کشمیر کے عوام زمین اور اس سرزمین کی پوشیدہ دولت سکھوں کی بادشاہت کے ایک ڈوگرہ جاگیردار مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دی۔

ہم اس بیعنامہ کو اخلاقی اور سیاسی نقطۂ نظر سے جائز ہونے کے دعویٰ کو چیلنج کرتے ہیں اس دستاویز کے وجود میں آنے میں کشمیر کے عوام کا کوئی حصہ

نہیں ہے اور اسی دستاویز کی رُو سے کشمیر کے عوام کو ۱۸۴۶ء سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے۔ آج ہندوستان کے باشندوں کا مستقبل زیرِ بحث ہے اور برطانوی وزارتی مشن مستقبل کے ہندوستان کا دستورِ اساسی بنانے میں مصروف ہے۔

راجاؤں اور نوابوں کے صلحناموں کے حقوق ہی ریاستوں کے عوام اور ریاستی حکومتوں اور راجاؤں نوابوں کے اختیاراتِ اعلیٰ کے مابین وجہ نزاع بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے کشمیر کے معاملے میں تو اس رشتہ کو تاریخی پس منظر میں دیکھنا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔

ہمارے کہنے کا حاصل مقصد یہ ہے کہ جس بیعنامہ کی رُو سے کشمیر ڈوگرہ خاندان کے ماتحت آیا، اس میں وہ اختیارات نہیں ملتے، جو ان نام نہاد صلحناموں کے حقوق کے نام سے محکوم ریاستوں کے وارث حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بحیثیت کُلّی خود کشمیر ہی کی مثال ٹھوس دلائل پر مبنی ہے۔ کشمیر کے عوام وزارتی مشن کی توجہ برطانوی حکومت کے چلے جانے کے بعد اپنے مطالبۂ آزادی کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ۱۸۴۶ء کا بیعنامہ جسے "صلحنامۂ امرتسر" کا غلط نام دے دیا گیا ہے۔ اس الجھن کو بالکل صاف کر دیتا ہے۔

کوئی بیعنامہ خواہ وہ کتنا ہی سخت کیوں نہ بنایا جائے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ چالیس لاکھ مرد اور عورت کو ایک ایسے مطلق العنان شخص کی غلامی کے سپرد کر دے کہ جس کے ماتحت وہ ایک منٹ بھی رہنا گوارا نہ کرتے ہوں۔ ہم کشمیری عوام اپنی قسمت کو خود تعمیر کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور ہم وزارتی مشن کے ممبران سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمارے بلند مقصد کی سچائی اور اس کی پائیداری کو تسلیم کریں۔

کشمیر برِاعظم ہندوستان کے شمال مشرق میں محض ایک جغرافیائی خطہ ہی کا نام نہیں ہے جو اپنی خوبصورتی اور قدرتی دولت کی وجہ سے مشہور ہے۔ بلکہ یہ خطہ زمین ایک نہایت اہم جگہ یعنی ہندوستان، چین اور روس کی مشترکہ سرحدوں پر واقع ہے اور اس وجہ سے اس کی بین الاقوامی اہمیت ہے۔ ہمارا یہ وطن کشمیری قوم کا گہوارہ ہے، جو اپنی زبان، تہذیب، رسوم اور مصیبتوں کی مشترک تاریخ میں یکسانیت کی بنا پر ہندوستان کی ان نادر جگہوں میں سے ہے کہ جہاں کے تمام فرقے کے لوگ ایک متحدہ قومی مطالبہ کی حمایت کرتے ہیں۔

سنہ ۴۶ء کے بحران کی وجہ سے ہمارے عوام کو جن تکالیف کو برداشت کرنا پڑا ہے اس کا صحیح اندازہ کشمیری عوام کے حقیقی معیار زندگی کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔ ہماری مصیبتوں کے حد سے گزر جانے ہی نے ہمارے احتجاج کو اتنی زبردست قوت دی ہے۔

ہماری حالت زار

کشمیر اور جموں کی ریاست ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ ۱۷۴۴۸ مربع میل کے وسیع رقبہ میں پہاڑ اور وادیاں اور جھیلیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا سالانہ لگان ڈھائی کروڑ روپے سے زائد ہے اور اس کا درجہ ہندوستان کی سب سے دولت مند ریاستوں میں تیسرا ہے۔ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی قطاروں سے لیکر پنجاب کے مٹیالے گرمی سے جھلسے ہوئے میدانوں تک ہمارے لوگ بسے ہوئے ہیں۔ ہم چالیس لاکھ انسان جموں و کشمیر، لداخ اور سرحدی خطوں میں پونچھ اور چینانی کے علاقوں میں سب مذاہب اور عقائد کے لوگ مسلمان، ہندو، سکھ، بدھ مت عیسائی، کشمیری پنڈت اور ہریجن موسم سرما و گرما کے دارالخلافوں میں یعنی سرینگر اور جموں میں نوے شہروں اور تقریباً نو ہزار گاؤں میں آباد ہیں۔ ہمارے ہر سو باشندوں میں

سے اپنی روزی زمین سے حاصل کرتے ہیں اور دُور دُور تنہائیوں میں بسے ہوئے گاؤں میں ضرورتوں کے مارے بیماریوں سے پریشان زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک کشمیری کی اوسطاً سالانہ آمدنی فی کس گیارہ روپے مشکل سے ہوتی ہے۔

یہ تھا وہ افلاس کا مارا ملک جو آج سے ایک صدی قبل ۱۸۴۶ء کے صلحنامہ کی رُو سے جس پر "کاپڈین اور برائٹ" کے دستخط ہوئے تھے، بیچ دیا گیا تھا۔ اور آج بھی جبکہ زار کی سلطنت کے تختہ کو الٹے ہوئے پچیس برس ہو چکے ہیں، کشمیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہؤا ہے۔ برطانوی شہنشاہیت اب بھی اس قسم کے صلحناموں کی ضامن بنی ہوئی ہے۔ اعتدال پسندی اور اصلاح پسندی کا زمانہ آیا اور ختم ہو گیا۔ انقلابات کا شعلہ بیز دور شروع ہؤا۔ اور تاریخ میں اپنی روشن رہگذر بنا دی لیکن جموں و کشمیر کی دور دراز سرزمین تاریک ازمنہ وسطیٰ کی روایات میں مبتلا رہی۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ قرن قبل ۳۲-۱۹۳۰ء میں کشمیر کے
گرم ہو جاتا ہے جب عوام نے اپنا مستقبل اپنے ہاتھ میں لیا اور مطلق العنان حکومت سے اپنے آزاد شہری حقوق چھیننے کے لئے ایک زبردست عام جدوجہد شروع کی۔ عوام کی یہ تحریک جو مسلم کانفرنس کے نام سے وجود میں آئی ۱۹۳۲ء میں کشمیر کے عوام کی جن میں دو تہائی مسلمان ہیں۔ عام جدوجہد کی رہنما بن گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۹۳۱ء کی سول نافرمانی کی تحریک نے تمام ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کانفرنس نے اگرچہ اس کا نام "مسلم" تھا خود بخود عوام کی مظلومیت اور گہری مصیبتوں کے اظہار کی تشکیل کر لی۔ لیکن اس کی رُوح قومی تھا۔ اور اس کے مدِّ نظر تمام فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کی بہبودی تھی۔

ہماری تحریک ترقی پذیر رہی اور جیسے جیسے دن گذرتے گئے ریاست

آگے قدم کی سرزمین میں اس کی جڑیں گہری ہوتی گئیں ۱۹۳۹ء میں ہم نے اپنی جماعت کا نام باقاعدہ طور پر تبدیل کر کے آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس رکھ لیا اور اس طریقہ سے ہر مذہب و ملت کے آزادی پسند محب وطن کو اپنے حلقہ میں شامل کر لیا۔ ہم بڑے بڑے طوفانوں میں سے گذر چکے ہیں۔ ریاست کے حکام اور ان کے کارندوں، عوام کو لوٹنے کھسوٹنے والے زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف جد و جہد کرتے ہیں ہم نے تشدد برداشت کئے جیلیں کاٹیں۔ گولیوں کا بھی مقابلہ کیا۔ اسی طرح نیشنل کانفرنس کی جد و جہد کسانوں اور دستکاروں کی زمانہ قدیم کی مفلسی اور مزدوروں کی لامتناہی لاچاری کے خلاف رہی ہے۔ کانفرنس کی قوت اس کی جمہوریت پسندیت اور بڑھتی ہوئی مقبولیت میں مضمر ہے۔ ترقی کے اس پورے عرصہ میں ہم ذمہ دار حکومت اور ریاست کے عوام کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا مطالبہ کرتے رہے۔

ہم اپنی قانونی جد و جہد کی پہلی منزل پر اس وقت پہنچ گئے۔ جبکہ ۱۹۳۴ء میں ۷۵ ممبروں پر مشتمل قانون ساز اسمبلی کا قیام ہوا۔ حالانکہ ان میں سے بھی ۴۲ ممبر نامزد کئے ہوئے تھے اور صرف ۳۳ چنے ہوئے۔ اس کا صدر بھی حکومت ہی کا رہا اور وزراء کی کونسل بھی ایک غیر ذمہ دار حکومت کی طرح ہز ہائی نس مہاراجہ بہادر کی خوشی پر ہی کام کرتی رہی۔ پہلے انتخاب کے بعد عوام کے نمائندے اسمبلی میں داخل ہوئے اور سب سے بڑا متحد گروہ بنایا۔ اس گروپ نے ہماری جد و جہد کو اسمبلی کی چار دیواری کے اندر بھی جاری رکھا۔ اس مجلس قانون ساز کے قیام اور اس کے بعد جو نام نہاد قانونی اصلاح ہوئی اس نے حقیقی اصلاح کا جواب پیدا کر دیا۔ کیونکہ درحقیقت عوام کے نمائندوں

کے ہاتھ میں تو کوئی اختیارات ہی نہیں تھے۔ اس سے قبل کہ ہم اس نام نہاد قانونی ترقی کا تفصیلی تجزیہ کر کے اس کا کھوکھلا ہونا ثابت کریں کہ اس قانونی اصلاح کی ٹٹی کی آڑ میں جو رجعت پسند شکار کھیلتے رہے ہیں اور جو درندگی بے رحمی اور بداخلاقی کی جا رہی ہے۔ اس کا پردہ فاش کر دیں۔

کشمیر کے پسماندہ علاقوں میں کیا گذر رہی

چنیانی زنجیروں کی بندش میں

ہے اس کی بہترین مثال ریاست کے اندر ایک ریاست چنیانی کی جاگیر بھی ملتی ہے۔ اور وہاں کی ظالمانہ حکومت سے بیزار ہو کر یہاں کے لوگ بغاوت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ وہ چند لوگ جو جموں سے سرینگر کی شاہراہ پر کُدسے گذرتے ہیں وہی اس کا اندازہ خوب لگا سکتے ہیں کہ اس خطۂ ارض پر کہ جہاں یہ واقع ہے، انسان کے حقوق پر کس بے شرمی سے ڈاکہ زنی کی جاتی ہے۔

اپنی رعایا پر جاگیر کے لاانتہا اختیارات ہیں۔ چنیانی کے باشندوں کی زندگی اور ان کا اثاثہ اس کی برسوں سے مطلق العنان اختیارات کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ تجارت اور پیداوار میں اس کی اجارہ داری ہے۔ غیر قانونی طور سے وہ بیہودہ سے بہانے پر بھی زمین پر قبضہ جما لیتا ہے اور چونکہ پولیس جیل اور قانون کی تمام مشینیں اس کے ہاتھ میں ہیں، اس لئے اس کی ان حرکتوں کو لگام دینے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ ٹیکس جمع کرنے والا وہی ہے۔ اناج کا کنٹرولر بھی وہی ہے۔ فوجداری اور دیوانی کا جج وہی ایک ہستی ہے۔ وہی وہ دکاندار ہے جو کنٹرول شدہ اشیاء فروخت کرتا ہے۔ اور وہی غریب کنگال

کسانوں کو اونچی اونچی شرح سُود پر قرض دیتا ہے۔ اس کو سیشن جج اور ڈسٹرکٹ جج کے اختیارات ہیں اور وہی اپیلیں سننے والا جج ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ راجہ خود ان پڑھ ہے اور اس لئے قانون کے اصولوں سے بھی ناواقف ہے۔ اپنے ساتھیوں کی امداد کی خاطر اگر کسی نے ان اذیت سوز حالات کے خلاف آواز بھی اٹھانے کی ہمت کی تو اُسے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ ایذائیں پہنچائی گئیں اور جیل میں ڈال دیا گیا۔

اس طرح تاریکی اور مظالم کے اس پس منظر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے

یہ اصلاحات کہ دراصل حکومت کتنے پانی میں ہے۔ ہم اپنے مشاہدہ کو ریاست کے صرف بڑے بڑے شہروں تک محدود نہیں کریں گے کہ جن کی حالت اگرچہ اچھی تو نہیں لیکن مقابلتاً بہتر ہے۔

اس جمہوری ڈھانچہ کا جو ابھی تک منظر عام پر آیا ہے۔ کھوکھلا پن رائے دہندگی کے اختیارات بنانے کی ایک کمیٹی نے عاید کی ہیں۔ اس کی رُو سے ۹۶ فی صدی آبادی کو حق رائے دہندگی حاصل نہیں ہے۔ یہ حق محض جائیداد اور تعلیم کی بنیاد پر مندرجہ ذیل درجوں کے لوگوں کو دیا گیا تھا۔

(ا) بیس روپیہ زمین کا لگان دینا۔

(ب) ۶۰۰ روپیہ مالیت کی جائیداد کا مالک ہونا۔

(ج) بیس روپیہ میونسپل کمیٹی ٹیکس ادا کرنا۔

(د) ۶۰ روپیہ کرایہ ادا کرنا۔

(ہ) آٹھویں جماعت تک تعلیم۔

(و) خطاب یافتہ ہونا

(ز) گاؤں کا مکھیا ہونا یا سرکار کا کوئی اور اعزازی عہدہ دار ہونا۔

(ح) پنشن یافتہ ہونا۔

تعلیمی خصوصیت کا ڈھونگ اس حقیقت سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ٹیکس کے معیار سے نیچے ہونے کے علاوہ مسلم آبادی جو کہ کل آبادی کا ۸۰ فی صدی ہے محض ۴ فی صدی تعلیم یافتہ ہے۔

۱۹۳۹ء میں دستور اساسی میں تبدیلی کر کے ۷۵ ممبران میں منتخب ممبران کی تعداد بڑھا کر ۴۵ کر دی گئی۔ چنے ہوئے ممبران کی تعداد میں سات ممبران کا یہ اضافہ دراصل دھوکہ ہے اس لئے کہ یہ زمینداروں اور جاگیرداروں اور پنشن یافتہ لوگوں کے خاص علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حق رائے دہندگی اتنا محدود ہے۔ کہ ایک علاقے میں رائے دہندگان کی تعداد پندرہ ہے۔ اور دوسرے ہیں محض ۱۶۔ چار غیر سرکاری پارلیمنٹری انڈر سیکریٹریوں کے لئے جگہیں بنائی گئی تھیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہز ہائی نس نے خود مقرر کئے تھے۔ اور ان کو دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دی گئی تھی۔ اُن کی وفاداری اپنے حلقے کے ووٹروں سے علیحدہ ہو کر حکومت کے ساتھ ہو گئی۔ اس قسم کی نام نہاد اصلاحات کا مجموعی نتیجہ منتخب شدہ ممبران کی قوت کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔ مجلس قانون ساز کا صدر ہز ہائی نس کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے اور عام طور پر وہ حکومت کے ججی یا کسی اور انتظامی محکمہ میں سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صدر کو اپنے فرائض کے ساتھ دیگر عہدوں کے فرائض انجام دینے سے روکنے کے لیے کوئی بندش نہیں ہے۔ ایک صدر ایک ہی وقت میں وزیر قانون، چیف جسٹس

وظیفوں کے بورڈ کا صدر اور قائم مقام وزیر اعلیٰ تھا۔ اس پر شاید مبارک باد دی جائے کہ وہ اس کے ساتھ ریاست کی فوجوں کا کمانڈر نہیں تھا۔

جس طرح انتخاب کے حلقے تقسیم کئے گئے ہیں، اس سے قانونی مشین
غیر حقیقی کے غیر حقیقی ہونے پر اور بھی روشنی پڑے گی۔ ریاست کے بہت بڑے علاقوں کو جن میں ہزاروں لوگ آباد ہیں، ان کو حق رائے دہندگی سے زبردستی محروم کر دیا گیا ہے کیونکہ ان علاقوں کی نمایندگی کرنے والے ممبر نامزد کئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے حلقے مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) لداخ کا پورا سرحدی علاقہ۔ اس طرح ریاست میں بدھ مت کے ماننے والے تمام لوگ حق رائے دہندگی سے محروم ہو گئے۔

(ب) پونچھ اور چینیانی جاگیر کے تمام ہندو۔

(ج) سرینگر شہر میں رہنے والے تمام ہندو علاوہ کشمیری پنڈتوں کے۔

(د) وہ سکھ جو جموں اودھم پور۔ ریاسی۔ کٹھوعہ۔ جنوبی کشمیر معہ شری پرتاپ سنگھ پور کی وزارتوں میں رہتے ہیں۔

(بحوالہ دفعہ ۴ جموں اور کشمیر ایکٹ ۱۹۳۹ء شیڈول ۳ اور ۴)

اور پھر خود انتخابی حلقوں میں عجیب مضحکہ خیز مثالیں ہیں۔ ایک حلقہ نمبر ۳۱ ہندو جو کشمیر کے ایک آخری کونے میں کوہالہ سے جو تقریباً ۲۰۰۰ فٹ اونچی چوٹی ہے، شروع ہوتا ہوا امرناتھ کے مقدس غاروں کی برف پوش چوٹیوں تک جو ۱۶۰۰۰ فٹ اونچائی پر ہیں پہنچتا ہے۔ اور یہ تقریباً ۲۲۰ میل کی وسعت میں پھیلا ہوا ہے۔ کہیں کہیں تو اس میں محض پہاڑی سلسلے ہی ہیں۔ ایک طرف جبکہ ایک خاص حلقہ

انتخاب میں سے پندرہ جاگیردار اپنا ایک نمایندہ بھیجتے ہیں، تو مظفر آباد اور ہندواڑہ کے حلقہ انتخاب میں سے بھی کہ جن میں رائے دہندگان کی تعداد تین لاکھ اور دو لاکھ ستر ہزار ہے، ایک ایک ہی نمایندہ منتخب ہوتا ہے۔

جمہوری جماعت

ایک جمہوری جماعت کے اختیارات کی کسوٹی یہ ہوتی ہے کہ اسے مالیات کے اوپر کتنے اختیارات ہوتے ہیں۔ ہماری ریاست میں اول تو کل اخراجات میں ۳۰ فیصدی (جس میں فوج کے اخراجات اور خرچ خاص کے اخراجات شامل ہیں) کانسٹی ٹیوشن ایکٹ دفعہ ۴۵ کی رو سے اسمبلی کے حق رائے دہندگی سے مستثنیٰ کر دیئے گئے ہیں۔ باقی تمام مدّوں کے اخراجات میں سے جنہیں اسمبلی نے رد کر دیا ہو، دفعہ ۴۵ (ا) کی رو سے وزراء کی کونسل کو یہ اختیارات ہیں کہ وہ اسے پاس کر دیں، اور وزراء کی کونسل اسمبلی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتی ہے۔

فوج

ہماری ریاست کی فوج کا سب سے ممتاز پہلو ریاست کی فوج میں بھرتی کرنے کا امتیازی سلوک ہے۔ ریاست کی فوج میں سوائے جموں کے چند فرقوں کے کسی بھی کشمیری کو چاہے وہ سکھ ہو، مسلمان ہو، یا کشمیری پنڈت ہو، بھرتی ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ دوران جنگ میں بھی کشمیریوں نے اپنی فوجی قابلیت کے ہنر صرف ہندوستانی فوج میں بھرتی ہو کر ہی دکھائے ہیں۔ کشمیریوں کی یہ ایک زبردست توہین ہے کہ ایک طرف تو انہیں پوری نشو و نما حاصل کئے ہوئے وجود کا درجہ دیا جائے اور دوسری جانب اُن سے یہ بھی کہا جائے کہ وہ ایک بیرونی فوج کے کل اخراجات کا بوجھ اپنے کندھوں پر سنبھال لیں۔

راجہ کا خرچ خاص ہماری ریاست کے اخراجات میں ایک اور

شاہی خرچ اہم چیز ہے بظاہر تو یہ ریاست کی کل آمدنی کا محض ۵ فیصدی ہے لیکن محکمہ شاہی گودام محکمہ رسومات ہز ہائی نس کے موٹر خانے اور شکار گاہیں یہ خرچ خاص میں شامل نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ دراصل سب اسی کا ایک حصہ ہیں

ان سب محکمات پر مجموعی خرچ بارہ لاکھ پچاس ہزار روپیہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہز ہائی نس کے گھریلو اخراجات ہیں جو تقریباً پانچ لاکھ روپے کے ہوتے ہیں۔ اور پھر ایک مد اور ہے۔ ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب جب گدی پر آئے تھے تو ان کی جاگیر اس لئے ریاست میں شامل کر دی گئی تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں حکمران اور رعایا دونوں نہ ہوں۔ اس لئے اس جاگیر کا معاوضہ ۸½ لاکھ روپیہ سالانہ ہز ہائی نس کو علیحدہ ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ہز ہائی نس انکم ٹیکس اور سائر کے ٹیکس مستثنٰی ہیں۔ یہ ٹیکس اگرچہ اوّلاً تو خزانہ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ہر سال کے آخر میں مہاراجہ کو واپس کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح ۳۱-۱۹۳۰ء میں تین لاکھ دس ہزار روپیہ مہاراجہ کو واپس کیا گیا تھا۔

اب بجٹ کی دیگر مدوں کو لیجئے تو بجلی، ریل، پانی وغیرہ اور قومی

دیگر بجٹ تعمیر کے محکمہ جات مثلاً کاشتکاری، باغات صنعت، مویشی، کواپریٹو، پنچایت اور دیہات سدھار۔ تو ان پر محض دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور صرف پولیس کے محکمہ کا خرچ دس لاکھ پچاس ہزار روپے سے زائد ہو جاتا ہے۔ کل بجٹ کا ۹ فیصدی سے کم تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔

حالانکہ اب بھی بہت بڑا ایسا علاقہ ہے جہاں تعلیم نہیں پہنچ سکی ہے۔ ریاست میں ایک ہزار سے بھی کم ابتدائی مدارس ہیں محض ۱۹ ہائی سکول ہیں اور لڑکیوں کا کالج ایک بھی نہیں ہے۔

میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت محض دو ہسپتال ایسے ہیں جو کہ قابل ذکر ہیں۔ ایک تو سرینگر میں اور دوسرا جموں میں۔ سرحد کے وسیع علاقہ میں کوئی ہسپتال ہی نہیں ہے۔

عورتوں کے لئے تین ہسپتال بالکل ناکافی ہیں۔ گورنمنٹ کا ہر دواخانہ ۸۰۰ مربع میل رقبے کے لئے وقف ہے اور اس کے درمیان میں اکثر پہاڑوں کے سلسلے آجاتے ہیں۔ اس حساب سے تناسب ۳۸۰۰۰ لوگوں کا ہوتا ہے۔ ذرائع آمدورفت ابتدائی زمانہ کے ہیں۔ ۸۵۰۰۰ مربع میل میں پختہ سڑک صرف ۵۰۰ میل کی ہے۔ اس میں ۳۵۰ میل لمبی وہ شاہراہیں بھی شامل ہیں کہ جو ریاست کو بیرونی ممالک سے ملاتی ہیں۔

کھوکھلی اصلاحات

اسی قسم کی کھوکھلی اصلاحات نے کشمیر کے سیاسی طور سے بیدار عوام کی جائز خواہشات کو ٹھیس پہنچائی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے اپنی جد و جہد کو اور تیز کریں۔ حقیقتاً مجلس قانون ساز بننے کے بعد کا دور وحشیانہ تشدد کے خلاف عوام کی شاندار جد و جہد اور بہادری کے واقعات سے بھرپور ہے۔

آخر کار عوام کی بڑھتی ہوئی تحریک کی قوت کے سامنے ہز ہائی نس کو ۱۹۴۴ء میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ مجلس قانون ساز کے سفارش کردہ چھ ناموں

میں سے دو کو وزیروں کی کونسل کے لئے نامزد کریں گے۔ گو ہم شروع میں ہی اس بات کو سمجھ چکے تھے۔ کہ انتظامی معاملات میں عوام کے ساتھ تعاون کرنے کا یہ ادھورا طریقہ خود اپنے اندرونی تضاد کے بوجھ سے دب جائے گا، لیکن پھر ہم نے اس تجربہ کو کامیاب کرنے کی سعی میں حکومت کے ساتھ تعاون کیا۔

دو عملی حکومت نیشنل کانفرنس کے نمایندے کو پی۔ ڈبلیو۔ ڈی اور میونسپلٹی کے محکمے علاوہ پنچایتوں کے سونپے گئے۔ اُسے سٹیشنری کی طباعت اور برطانوی ہندوستان میں ریاست کی مملکت کی نگہبانی دی گئی عوام کی سب سے بڑی نمایندہ جماعت کے نامزد کئے ہوئے ممبر کو اس قسم کی ذمہ داریاں سونپنا ایک مضحکہ خیز امر معلوم ہوتا ہے۔ مرزا محمد افضل بیگ کو ایسے محکمہ جات کے انتظام سے مستثنیٰ رکھنا جن کا اثر عوام الناس کی زندگی پر پڑتا ہے۔ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے۔ ہم اب وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں یہ بدنام کرنے کی ایک باقاعدہ سازش تھی، جو رفتہ رفتہ ہم پر عیاں ہوگئی۔ کیا کبھی یہ تصور کیا جا سکتا تھا کہ ایک منسٹر بغیر امدادی عملہ کے جو براہِ راست اس کے سامنے جواب دہ ہو۔ کہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح سرانجام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے وزیر نے میونسپل ایکٹ کے اندر ایسی ترمیمات پیش کی۔ جو عوام کی شہری زندگی پر اثرانداز ہونے کے لئے نہایت اہم اور دُور رس ہوتیں اور جن کا مقصد یہ تھا کہ میونسپل کمیٹیوں میں جمہوری اصولوں پر عمل ہو۔ لیکن تمام اقدام ابھی کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں۔

شہری آزادی شہری آزادی کے حقوق پر اثرانداز ہونے والے

قوانین امن و امان قائم رکھنے کے نام پر جاری کئے گئے لیکن مرزا محمد افضل بیگ کو ان تمام سے بالکل بے خبر رکھا گیا۔ اس کی بدترین مثال یہ ہے کہ اس قسم کے اقدامات خود ان کے حلقۂ انتخاب کے علاقے میں نافذ کئے گئے اور اس کی انہیں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ اس لئے ان حالات کے ماتحت یہ بالکل مضحکہ خیز بات ہے۔ کہ عوام کے نمائندہ وزیر سے یہ امید کی جائے کہ وہ ہر بات میں کیبنٹ کے وزراء کے ساتھ متفق ہو اور اپنے اختلاف رائے رکھنے کے حق کو خیرباد کہہ کے انہیں اسمبلی کے سامنے کھلے طور پر نہ رکھے۔ یا غیر جانب دار بھی رہے۔ عملی طور پر اس کے معنی عوام کے مفاد کے ساتھ غداری ہوتی اور اپنی پارٹی کی پالیسی کی خلاف ورزی۔ جس نے اُسے نامزد کیا تھا۔

قانونی طور پر بھی کانسٹی ٹیوشن ایکٹ میں تبدیلی ہونے کے بعد عوام کے وزیر کی اسمبلی کے ایک منتخب ممبر ہونے کی حیثیت باقی رہتی تھی۔ اور اس طرح وہ اپنے رائے دہندگان کی طرف اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے۔

قانونی جمود

سر بی۔ این راؤ کے زمانہ میں جو پہلے وزیر اعلیٰ تھے۔ کام چلانے کے لئے ایک فارمولے پر بحث ہو گئی تھی۔ اس کی رُو سے اختلاف رکھنے والا وزیر اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لئے اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کر سکتا تھا۔ اور پھر رائے شماری کے وقت غیر جانبدار رہ سکتا تھا۔ نئے وزیر اعلیٰ رائے بہادر پنڈت آر۔ سی کاک نے راؤ فارمولا کو مسترد کر دیا اور اس طرح قانونی جمود پیدا ہو گیا۔ یہ متضاد چیز ہے کہ ایک وزیر غیر ذمہ دار حکومت کے

ہر اقدام کی حمایت بھی کرے اس لئے ہم نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔

تخریبی کوششیں وزیراعلیٰ نے غیر ذمہ دار نوکرشاہی کی امداد سے خود نیشنل کانفرنس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور رشوتیں دینے کی گھٹیا سازشیں شروع کیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے نہایت عیارانہ چالیں چلیں اور اسمبلی پارٹی کے لیڈر میاں احمد یار ان کا شکار ہو گئے۔ اُن کا تقرر براہ راست مہاراجہ کے حکم سے ہوا۔ اور اس لئے اب ان کی نمائندہ حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح مہاراجہ نے عوامی وزیر کا تقرر انتخابی طریقہ سے نہ کر کے نہ صرف دوعملی حکومت کے تجربہ کا قتل عام کیا ہے۔ بلکہ کشمیر میں عوامی تحریک کے خلاف سازش میں وہ خود ایک جتھہ دار ہو گئے ہیں۔

وزارتی مشن عوام کے حقوق پر یہ حملہ اور اُن کی نمائندہ جماعت کے اتحاد کو نقصان کی یہ سازش اس وقت عمل میں آتی ہے جبکہ ہندوستان کے لئے برطانوی کیبنٹ مشن کے دستور اساسی بنانے کی کوشش کرنے کی وجہ سے کشمیر کے عوام کو نئے حالات اور نئے مواقع سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ متذکرہ بالا تمام واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس قانون کا اصل مقصد جانبدارانہ پابندیاں عاید کرنا اور اختیارات کو محدود کرنا ہے۔ اس لئے جس چیز کی امید کی جاسکتی ہے۔ وہ ہیں حکومت چلانے کے لامحدود اختیارات اور یہی عام طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ معمولی سے معمولی بہانے پر جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں پر پابندیاں لگ جانا تو ایک عام اصول بن گیا ہے۔

فوجی قوت کی نمائش خاص طور پر سرحدی علاقوں میں روزمرہ کے فرائض میں شامل ہوگئی ہے۔

مسلح قوت کا یہ مظاہرہ عوام کے دلوں میں ایک نفرت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ عام طور پر غیر مسلح ہیں۔ بغیر لائسنس کے ہتھیار رکھنے کی اجازت سوائے ہندو راجپوتوں کے اور کسی کو نہیں ہے۔

مستقبل کا سودا

غلام عوام کی بیچارگی نے ریاست کی سرزمین کو اقتصادی بھیڑیوں کے لئے بہترین شکار گاہ بنا دی ہے اور حکومت کا موجودہ عملہ عوام کے قومی حقوق کی حفاظت کرنے میں اپنی کامل نالائقی کا ثبوت بہم پہنچا چکا ہے۔ دراصل خود انہوں نے ہی ریاست کے عوام کے حقوق کو پامال کر کے بیرونی سرمایہ داروں کے ہاتھ جو ہماری سرزمین کی بیش بہا دولت پر درخت گاڑھے بیٹھے ہیں، بیچ دیا ہے۔

اس سودے کی سب سے بڑی مثال وہ راضی نامہ ہے، جو وزیراعلےٰ آر۔ سی کاک نے جموں اور کشمیر کی حکومت کی طرف سے بمبئی کی نیو انڈیا انشورنس کمپنی کے ساتھ ۱۹ستمبر ۱۹۴۵ء کو کیا ہے۔ جس کی رُو سے حکومت رضامند ہوگئی ہے کہ تمام سرکاری ملکیت کا بیمہ جو ریاست کے اندر یا ریاست کے باہر ہے، صرف ایسی کمپنی میں کیا جائے گا۔ یہ راضی نامہ سات سال کے لئے کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے جو بھی کاروباری جائز مقابلہ ہو سکتا تھا۔ وہ ختم کر دیا گیا ہے اور اس طرح ریاست کے اندر بیمہ کے بیوپار کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ کشمیر کے وہ سینکڑوں خاندان جو بیمہ کاروبار کی ملازمت کرتے تھے، ان کی روزی خطرہ

میں پڑ گئی ہے۔

مکمل آزادی ریاست کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہز ہائی نس مہاراجہ نے ٹاٹا کمپنی کو ٹھیکہ دیا ہے اس سے ٹاٹا کو صنعتیں لگانے یا نہ لگانے کے خصوصی اختیارات مل جاتے ہیں۔ اس قسم کے اہم راضی نامہ پر عوام کی ذرا بھی رائے لئے بغیر مہاراجہ کا دستخط کر دینا عوام کے اس مطالبے کو بالکل صحیح ثابت کر دیتا ہے کہ عوام کی منتخب شدہ نمائندہ حکومت کا فوراً قیام کیا جائے۔ ہماری زندگی اب اسی میں ہے کہ موجودہ حالات کے ماتحت ہماری مکمل آزادی تسلیم کر لی جائے۔

مستقبل کے معمار کشمیر کے عوام کا یہ مطالبہ کہ انہیں خود اپنے مستقبل کا معمار بننے دیا جائے، لوٹ کھسوٹ کی اس تاریخ اور اقتصادی ذرائع کو اس طرح دوسروں کے حوالے کر دینے کے پس منظر میں حق بجانب نظر آتا ہے۔ پہلے برطانیہ نے ہمیں ڈوگرہ جاگیرداروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اور اب سو برس کے بعد خود ڈوگرہ خاندان ہمیں برطانوی ہندوستان کی اقتصادی جونکوں کے خاندان کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے۔

اس طرح آج جبکہ معاہدہ اوقیانوس کی بنیادوں پر ایک نئی دنیا کی تعمیر ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے عوام کے سامنے بھی آزادی کی نئی راہیں کھل رہی ہیں اور کشمیری قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے اور اس فیصلہ کن موقعہ پر ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں آزاد ہندوستان کی مجالس دستور ساز میں اپنے منتخب شدہ نمایندوں کو بھیجنے کا جمہوری حق حاصل ہونا چاہیئے۔ ہم راجوں

اور نوابوں کو ریاستوں کے عوام کا نمایندہ ہونے یا انہیں خود اپنے نمایندے نامزد کر کے بھیجنے کے حق کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرتے ہیں۔

ہم برطانوی کیبنٹ مشن کی بہترین جمہوری خواہشات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمارے عوام کے صحیح جذبے سے غداری نہ کریں۔ یا اس جذبہ آزادی کی قوت کو کم نہ سمجھیں۔

شیر کشمیر کی تاریخی تقریر یہ یادداشت ارسال کرنے کے بعد کشمیری عوام کو خطاب کرتے ہوئے شیر کشمیر نے کہا:

"ڈوگروں کے ظلم نے ہماری روحیں زخمی کر دی ہیں۔ کشمیری ایک وجیہہ اور حسین قوم ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حلیے بگڑے ہوئے ہیں۔ یہ عمل کا وقت ہے۔ اپنی مفلسی کو ختم کرنے کے لئے تمہیں غلامی سے لڑنا ہوگا۔ اور اس کے لئے مجاہدوں کی طرح میدانِ جہاد میں اترنا ہوگا۔ ہماری جد وجہد کا نعرہ محض ہماری ریاست کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ سارے ہندوستان کے لئے ہے۔ ہندوستان سامراجی نظام کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ یہ نعرہ راوی کے کنارے لگایا گیا تھا۔ اس کے بعد "ہندوستان کو چھوڑ دو" کا نعرہ ہمارے سامنے آیا۔ برطانیہ نے غدارانہ چالبازیوں اور اپنی تلوار سے ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کیا ہندوستان کے والیانِ ریاست نے جو ہندوستان کے چوتھے حصے پر قابض ہیں، ہمیشہ ہندوستان کے مسئلہ آزادی کے ساتھ غداری کی ہے یہ مطالبہ کہ "ریاستی حکمران نکل جائیں"۔ ہندوستان چھوڑ دو" کی پالیسی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ جبکہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی انگریزی اقتدار

کو ہندوستان سے ختم کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے، ضروری ہے کہ برطانوی سامراج کے پٹھو یعنی ہندوستانی والیانِ ریاست بھی اختیاراتِ حکمرانی (SOVERIEGNTY.) لوگوں کو واپس سونپ دیں۔ جب ہم "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ لگاتے ہیں تو ہم قدرتی طور پر یہ تصور کرتے ہیں کہ تمام راجوں اور نوابوں کو اپنی اپنی ریاستیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ مطالبہ حیدرآباد جیسی ریاست پر بھی منطبق ہو سکتا ہے، جہاں میں توقع کرتا ہوں کہ لوگ "حیدرآباد چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کریں گے۔

رام چندر کاک کی طرح جو ہندو یہ چاہتے ہیں کہ ڈوگرہ راج قائم رہے۔ اُن کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ کشمیر میں ہمارے ساتھ ایک زر خرید کمزور قوم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور اس میں مذہب کوئی فرق نہیں ڈالتا ہے۔ ریاستی فوج میں ہماری بھرتی پر پابندیاں کیوں ہیں؟ اس کی وجہ ہے کہ ڈوگرہ خاندان کے افراد کو جب کبھی کوئی جاگیر دی جاتی ہے، تو وہ کشمیر کے خطے میں ہی دی جاتی ہے؟ کیا کشمیریوں اور دوسرے تمام عوام کو ایسے ہی حقوق حاصل ہیں؟

ہمارے سوالات کا جواب ہتھکڑیوں کی جھنکار سے دیا جاتا ہے، لیکن وہ ہمیں خوف زدہ نہیں کر سکتیں، کامیابی کے لئے خدا ہمارا سہارا ہے۔ حق کی آواز غالب آئے گی۔ پیغمبروں نے سچائی کی حمایت کی ہے اور سچائی ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔

حکمرانی کسی حکمران کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ ہر کشمیری مرد، عورت اور بچہ "کشمیر چھوڑ دو" کی آواز بلند کرے گا کشمیری قوم نے اپنے ارادے کا

اظہار کر دیا ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس مسئلہ پر جمہور کی رائے حاصل کی جائے۔"

شیخ صاحب کی اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ تمام وادی میں "کشمیر چھوڑ دو" کی صدائے بلند ہونے لگیں۔ اور حکومت کشمیر اس عوامی تحریک کو کچلنے کی تدابیر کرنے کے لئے سنگین ذرائع اختیار کرنے پر اُتر آئی۔

اُن دنوں حفیظ جالندھری نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی اس تقریر سے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے ؎

شیر وادی میں دھاڑا گونج اٹھے کوہسار — ہو گئے بیدار مزدور اور جاگے کاشتکار
چار سو آزادیٔ جمہور کی سُن کر پکار — ہو گئی برہم نشے میں نخوتِ سرمایہ دار

عیش کے کانوں میں پیغام اجل آنے لگا
کاروبارِ شہریاری میں خلل آنے لگا

ہل کے بیٹھے چوہنڈی کے پرانے سٹہ باز — جانے پہچانے ہوئے ٹھگ سیانے سیانے جعلساز
اور اُن کے درمیان وہ توند صوفے پر دراز — "توندابنِ توند" کہلانے پر جس کو فخر و ناز

مسئلہ کشمیریوں کا بحث میں لایا گیا
توند کی جانب سے یہ ارشاد فرمایا گیا

کیا مچا رکھا ہے ان لوگوں نے اتنا شور و شر — ذبح ہونے سے بدکنے لگ گئے کیوں جانور
لاؤ ان کی چند مادائیں بلاؤ چند نر — پھوڑ ڈالو انکی آنکھیں توڑ ڈالو ان کے سر

"چھوڑ دو کشمیر" کہنے کا مزا ان کو چکھاؤ
جاؤ قیدِ زندگی سے اُن کو آزادی دلاؤ

چھوڑ دو کشمیر یعنی چھوڑ دیں کشمیر ہم　　بھگ منگوں کو سونپ دیں یہ خانگی جاگیر ہم

پیٹ پوجا کی کریں اب اور کچھ تدبیر ہم　　دیدیں ان کتوں کو یہ پکی پکائی کھیر ہم

لگ گئی ان کی ہمارے پیٹ پر بھی ناک جی

پاک کرنا ہی پڑے گا اب یہ جھگڑا کاک جی

یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد سب ہیں زرخرید　　ان کے بچے بچیاں اولاد سب ہیں زرخرید

ہو نہیں سکتے کبھی آزاد سب ہیں زرخرید　　تا قیامت خانماں برباد سب ہیں زرخرید

برجبین کہتر و مہتر ہماری مُہر ہے

ماں کے پیٹوں میں بچوں پر بھی ہماری مُہر ہے

لوٹ لی انسان کی قسمت پچھتر لاکھ میں　　بک گئی کشمیر کی جنت پچھتر لاکھ میں

سرو کا سرمایۂ محنت پچھتر لاکھ میں　　عورتوں کا جوہر عصمت پچھتر لاکھ میں

ملک ملت قوم مال و جان پچھتر لاکھ میں

ہاں پچھتر لاکھ ہیں، ہاں ہاں پچھتر لاکھ میں

گرفتاری برطانوی کیبنٹ مشن کو یادداشت ارسال کرنے کے بعد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے تمام وادی کا دورہ شروع کر دیا۔ اور آپ نے وادی کے حالات سے عوام کو باخبر کیا۔ کہ برطانوی اور ڈوگرہ حکومت کے عزائم کیا ہیں۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں کن ادوار سے گزرنا ہے۔ تبلیغ و تقریر کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا۔ کہ شیخ محمد عبداللہ کو سرینگر راولپنڈی روڈ پر بمقام گڑھی برز سوموار بتاریخ ۲۰ مئی گرفتار کر لیا گیا۔ اور بقول گلوب نیوز ایجنسی"

اس خبر کے ملتے ہی فوجوں کو کوچ کا حکم ملا اور آن کی آن میں گورکھوں اور

ڈوگرہ سپاہیوں کے جھنڈ کے جھنڈ سرینگر اور اس کے مضافات پر چھا گئے اور شہر کے گرد ایک فولادی حلقہ ڈال دیا گیا۔ اور ایک مشینی" باقاعدگی کے ساتھ بڑے پیمانے پر" انسانوں" کا شکار شروع کیا گیا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر سینکڑوں انسان فوجی لاریوں میں بٹھا بٹھا کر بادامی باغ چھاؤنی میں لائے گئے"۔ اور تمام وادی خون و آگ کی لپیٹ میں آگئی"۔

اور پھر

"ایک افسر نے غیر رسمی طور پر اس بات کو تسلیم کیا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس سوچے سمجھے منصوبہ جنگ کا ایک حصہ تھا۔ جو حکومت نے شیخ عبداللہ کی کھلی بغاوت کے خلاف پہلے سے ہی تیار کر لیا تھا، لیکن جس شخص نے بغاوت کا علم بلند کیا تھا، اُسے اور اس کے ساتھیوں پر ملہ بول کر چند گھنٹوں کے اندر اندر جیل کی چار دیواری میں بند کر دیا گیا تھا، اب تو یہ ہمہ گیر جنگ بیکس عوام کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔

تبصرے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد تمام ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا۔ ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی تحریکوں کے راہنماؤں اور ہندوستان پریس نے کھلم کھلا کشمیر سرکار کی اس سنگدلانہ جرأت اور ناروا فعل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ پنجاب کے مسلمانوں نے کشمیری مسلمانوں پر مظالم کو گہرے رنج اور دکھ کے ساتھ محسوس کیا۔ اور بقول نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ صدر پراونشل مسلم لیگ

"کشمیر کی بدقسمت وادی میں آئینی آزادی کے مطالبہ کو کچل کر دبا دینے کے

لئے کشمیر کی حکومت نے جلیانوالہ باغ کی بھیانک داستان تقریباً دہرادی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ریاست کے ڈوگرے سپاہیوں نے عوام کے لہو کا جو دریا بہایا ہے، وہ عوام کے باہمی جھگڑوں اور تفرقوں کے خس وخاشاک کو بہائے جائے گا۔ اس قسم کا خوفناک ناٹک جو کشمیر میں ہوا اور ہو رہا ہے ظاہر ہے کہ مسلمانوں بلکہ ہر ایمان دار ہندوستانی کو شدید صدمہ پہنچائے گا اس مصیبت اور آزمائش کے موقعہ پر میں اپنے کشمیری بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ان سے انتہائی ہمدردی ہے۔

(نیا زمانہ ۹ جون ۴۶ء)

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پنڈت جواہر لعل نہرو کے بیان کا بھی مطالعہ کیجئے جنہوں نے خود کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر حکومتِ کشمیر نے ان کو روک لیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے شیرِ کشمیر کی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہر وہ شخص جو کشمیر کو جانتا ہے لازمی طور پر اس قدر و منزلت کو بھی جانتا ہے جو شیخ محمد عبداللہ کو وہاں حاصل ہے۔ وہ کشمیر کی دور دراز وادیوں میں لوگوں کا محبوب اور اُن کا شیرِ کشمیر ہے۔ اس کی شخصیت کے گرد لاتعداد افسانوں اور عوامی گیتوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ وہ ریاستی عوام کی تحریک میں میرے سب سے بڑے اور بیش قیمت ساتھی رہے۔ اور میں ہر اہم معاملے میں ان کی رائے لیتا رہا ہوں کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہم ان سے یا ان کے ساتھیوں سے کنارہ کشی کر لیں گے، اس لئے کہ حکومت کشمیر کے پاس چند بندوقیں ہیں۔ ہم یقیناً اس بھاری امتحان میں جس میں اس وقت کشمیر کے لوگ اور ان کے رہنما گذر رہے ہیں، ان

کے دوش بدوش کھڑے رہیں۔ مگر اب یہی جواہر لعل نہرو اپنے ملیش قیمت ساتھی کو گرفتار کرنے کے موجب اور عوامی گیتوں کی لے کو توڑنے کے داعی بنے ہیں

بیڑیاں کس نے خیالات کو پہنائی ہیں
کہیں نغمے بھی گرفتار ہوئے ہیں اے دوست

"تحریک کشمیر چھوڑ دو" کی پاداش میں حکومت کشمیر نے شیخ عبداللہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ اس مقدمے کی روداد یہ ہے۔

مقدمہ بغاوت "کشمیر چھوڑ دو"

مقدمہ بغاوت "کشمیر چھوڑ دو"

بعدالت لالہ برکت رائے بی، اے، ایل، ایل، بی سیشن جج کشمیر سرینگر

کریمینل نمبر ا — (A) — 2003

حکومت بوساطت وزیر سروپ چند ۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس سری نگر

بنام

شیخ محمد عبداللہ ولد شیخ محمد ابراہیم

ساکن سورہ (سری نگر)، ا ۔ پی ۔ سی

پنڈت مدسودھن کاک و دیگر سرکاری وکلاء کے

برائے شیر کشمیر ۔ مسٹر آصف علی و مسٹر دیا لعل کچلو ۔

استغاثہ کے مطابق شیخ محمد عبداللہ نے ماہ مئی ۱۹۴۶ء میں مندرجہ ذیل تقاریر کیں :-

(۱) "ہندوستان کے تین حصے براہ راست انگریزوں کے غلام ہیں اور ۱/۴ حصہ INDIRECT انگریزوں کے ماتحت ہے اس حصے میں ۱۰ کروڑ انسان غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس بدقسمت حصہ میں کشمیر بھی ہے۔ جہاں ۴۰ لاکھ ڈوگرہ راج کے تلے مصیبت میں پڑے ہوئے ہیں اس وقت آدمی کو ہر آزادی کا حق ہے۔ کشمیر کے 30 لاکھ آدمی ڈوگرہ راج کی غلامی میں کس طرح رہیں گے (۱۰ مئی ۱۹۴۶ء)

(2) ایک حقیر رقم میں ایک بنیئے کو یہ ملک بیچ ڈالا ہم روپیہ جمع کریں گے۔ اور اس کو کہیں گے کہ کسی گاؤں میں جاؤ اور یہ جگہ خالی کرو۔

(۱۰ مئی ۱۹۴۶ء)

(3) اس بیعنامہ نے ہماری قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ لہٰذا آپ کہیں کہ 'کشمیر چھوڑ دو'۔ بیعنامہ کو توڑ دو۔" ہمارا حق ہے کہ ڈوگرہ شاہی حکومت سے آزادی کا حق حاصل کریں۔ (۱۰ مئی ۱۹۴۶ء)

(4) مہاراجہ گلاب سنگھ کے وارثوں کو اس ملک میں کوئی حق نہیں ہے۔ ہم انگریزوں سے کہنا چاہتے ہیں کہ مہاراجہ ہری سنگھ کو اس ملک میں راج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایک تھوک فروش نے ہمیں خریدا۔ اور اب وہ پرچون فروشوں میں ہمیں تقسیم کرتا ہے۔ (۱۰ مئی ۱۹۴۶ء)

(5) آپ کا فرض ہے کہ اپنی تحریک کو ایک مقصد پر رکھیں۔ آپ پر فرض ہے کہ ڈوگرہ شاہی راج کو ختم کر دیں۔ آپ کا فرض ہے کہ سب کو دعوت دیں

اور کہیں کہ ہمیں ڈوگرہ شاہی حکومت سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ خواہ اس میں آپ کی جان، دولت مکان، تباہ ہو جائیں۔ اس سے زیادہ اچھا وقت اور کوئی نہیں کہ ڈوگرہ شاہی کو ختم کر دیں۔

اور پھر ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

(1) "آج تک مختلف طریقوں سے میری آواز دبانے کی کوشش کی گئی۔ میں نے یہاں کے مہاراجہ ہری سنگھ سے انتہائی عقیدت دکھائی اور کہا کہ اگر آپ صرف کروڑوں روپیہ جو عیش و عشرت میں خرچ کرتے ہیں۔ اس رقم میں سے غریبوں کی حالت بناتے تو بہتر تھا، مگر جوں جوں میں کہتا گیا، توں توں ہم پر ظلم و ستم روا رکھا گیا۔" (۱۶ مئی ۱۹۴۶ء)

(2) "ہم اس ملک کے ۳۰ لاکھ آدمی جائیداد وغیرہ کے سمیت ۵۰ لاکھ روپیہ میں بیچے گئے۔ جب ہم بیچے گئے ہم سے ایسا سلوک کیا گیا جو ایک جانور سے کیا جاتا ہے۔ بیگار میں لوگ لئے جاتے تھے، جو بے کفن مر جاتے تھے۔ اس ظلم کی وجہ سے یہاں کے لوگ باہر بھاگ گئے۔" (۱۶ مئی ۱۹۴۶ء)

(3) "ہم نے اب یہ اچھی طرح محسوس کیا ہے کہ یہاں پر ہم تب تک آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔ جب تک ڈوگرہ شاہی کا خاتمہ نہ ہو۔ اب اس بیعنامہ میں ایک مدّ ہے۔ مہاراجہ کے اقتدار کی وہ بھی ختم ہو۔"

(4) "نیشنل کانفرنس کا یہ پروگرام ہے کہ ڈوگرہ شاہی کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔ اس ملک کی حکومت یہاں کے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونی چاہیئے۔"

(5) اس ملک میں آپ کو راج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ سو سال کی

مفلوک الحالی کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ راج ہم نے کبھی قبول نہیں کیا نہ کرینگے اس حق کے لئے ہمیں انتہائی قربانی دینی ہوگی۔ سو سال کے بعد ایک سال بھی ڈوگرہ شاہی کے غلام بن کر نہیں رہیں گے۔ جب تک ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

(۶) "آپ تیاریاں کریں۔ آپ اس آواز کے پیامبر ہیں کہ اس غلامی کی زنجیروں کو ختم کر دیں گے۔"

"ریاستی ہندو سکھ مسلم کیا چاہتے ہیں۔ وہ غلام در غلام زندگی سے نجات چاہتے ہیں۔ راجوں مہاراجوں کی عیش پرستی کے مزید شکار نہیں ہونا چاہتے۔ چالیس لاکھ (۴۰۰۰۰۰۰) آدمی ایک آدمی کی عیش پرستی کا شکار ہو رہے ہیں۔"

"میں اُن ہندوؤں سے جو ڈوگرہ راج کی جے پکارتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ ڈوگرہ راج بناؤ کیا ہے؛ اس کی بنیاد شرمناک غداری ہے۔ میں آج ۱۹۴۶ء میں اس شرمناک غداری کا انتقام مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں سے لوں گا۔"

"اس نے پیشگوئی کی کہ وقت آئے گا کہ جب ان قبروں سے کشمیر کی قبروں سے مردے کفن پھاڑ کر نکلیں گے اور کہیں گے۔ ڈوگرہ راج مردہ باد۔ کشمیر کو چھوڑ دو۔ کوئی طاقت کوئی سازش اس قوم کو غلام نہیں رکھ سکتی۔"

"کشمیر کی آزادی کا فیصلہ ہمیں اپنے خون سے کرنا ہے۔ ہم سو سال بعد اس ڈوگرہ راج کو ختم کر دیں گے۔ جنگ کا بگل بجا نہیں ہے کسی وقت بجے گا۔ اس شرمناک غداری کا انتقام لو۔"

"یہ لڑائی ۱۹۴۶ء میں اس شرمناک غداری کے ساتھ ہے جس کا انتقام لینا ہے۔ یہ جنگ پاک جنگ ہے۔ لوگوں کو اس جنگ میں شریک ہونے کی تلقین کرو۔ لوگوں کے خون اور پسینہ کی کمائی جو لوگ کتوں پہ گھوڑوں پہ خرچ کرتے ہیں وہ ظالم سے بھی بدتر ہے ان کے پھندے سے چھوٹنا ہر ایک آدمی کا فرض ہے۔"

ایک اور تاریخی تقریر۔

"ڈوگروں کے ظلم نے ہماری روحیں زخمی کر دی ہیں کشمیری ایک وجیہہ اور حسین قوم ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے حلیئے بگڑے ہوئے ہیں۔ یہ عمل کا وقت ہے۔ اپنی مفلسی کو ختم کرنے کے لئے تمہیں غلامی کے ساتھ لڑنا ہوگا اور اس کے لئے مجاہدوں کی طرح میدان جہاد میں اترنا ہوگا۔ ہماری جدوجہد کا نعرہ محض ریاست کے ہی لئے نہیں ہے بلکہ یہ سارے ہندوستان کے لئے ہے۔ ہندوستان سامراجی نظام کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ نعرہ راوی کے کنارے لگایا گیا تھا۔ اس کے بعد "ہندوستان کو چھوڑ دو" کا نعرہ ہمارے سامنے آیا۔ برطانیہ نے غدارانہ چالبازیوں اور اپنی تلوار سے ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ ہندوستان کے والیان ریاست نے جو ہندوستان کے چوتھے حصے پر قابض ہیں ہمیشہ ہندوستان کے مسئلۂ آزادی کے ساتھ غداری کی ہے۔ یہ مطالبہ کہ ریاستی حکمران نکل جائیں۔ ہندوستان چھوڑ دو کی پالیسی کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ جبکہ ہندوستان کی تحریک آزادی انگریزی اقتدار کو ہندوستان سے ختم کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ ضروری ہے کہ برطانوی سامراج کے ہٹتے ہی ہندوستان والیان ریاست بھی اختیارات شاہی SOVERIEGINTY لوگوں کو واپس سونپ دیں۔ جب ہم کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ لگاتے ہیں تو ہم قدرتی طور

پر تصور کرتے ہیں کہ تمام راجوں اور نوابوں کو اپنی اپنی ریاستیں چھوڑ دینی چاہئیں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ یہ مطالبہ حیدر آباد جیسی ریاست پر بھی حاوی ہو سکتا ہے۔ جہاں میں توقع کرتا ہوں کہ لوگ "حیدر آباد چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کریں گے۔

رام چندر کاک کی طرح جو ہندو یہ چاہتے ہیں کہ ڈوگرہ راج قائم رہے ان کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کشمیر میں ہمارے ساتھ ایک "خرید کردہ قوم" کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور اس میں مذہب کوئی فرق نہیں ڈالتا ہے۔

ریاستی فوج میں ہماری بھرتی پر پابندی کیوں؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ڈوگرہ خاندان کے افراد کو جب کبھی کوئی جاگیر دی جاتی ہے تو وہ کشمیر کے خطے میں ہی دی جاتی ہے۔ کیا کشمیریوں اور دوسرے تمام ریاستی عوام کو ایسے ہی حقوق حاصل ہیں؟ ہمارے سوالات کا جواب ہتھکڑیوں کی جھنکار سے دیا جاتا ہے لیکن وہ ہمیں خوف زدہ نہیں کر سکتیں۔ کامیابی کے لئے خدا ہمارا سہارا ہے۔ حق کی آواز غالب آئے گی۔ پیغمبروں نے سچائی کی حمایت کی ہے۔ اور ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔

"بادشاہت" کسی حکمران کا پیدائشی حق نہیں ہے۔ ہر کشمیری مرد۔ عورت اور بچہ "کشمیر چھوڑ دو" کی آواز کو بلند کرے گا۔ کشمیری قوم نے اپنے ارادہ کا اظہار کر دیا ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ اس مسئلے پر جمہور کی رائے حاصل کی جائے۔ مستقبل ہمیں پکار رہا ہے اور اس کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایسا مستقبل جو ہم سب کے لئے ایک مشترکہ وراثت چلا آ رہا ہے۔"

شیخ محمد عبداللہ کا عدالتی بیان

مجھے اپنی ذاتی صفائی پیش کرنے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں اور میں ہرگز اپنی صفائی کا انتظام نہ کرتا۔ اگر مجھے یہ محسوس ہو چکا ہوتا کہ "بغاوت" کا مقدمہ میرے خلاف ذاتی الزام کی نوعیت سے بہت بڑی چیز ہوگی درحقیقت یہ مقدمہ جموں و کشمیر کی ساری آبادی کے خلاف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ اپنے "ذاتی مفاد" یا خوف کی وجہ سے کھلے بندوں اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔

ریاست کے عوام حد درجہ کی غریبی اور ذلت میں دبے ہوئے ہیں۔ ان کو کسی قسم کی آزادی یا ترقی کا موقع نصیب نہیں۔ گذشتہ سولہ سال سے میں ان مظلوموں کی حتی المقدور ادنیٰ سی خدمت کرنے میں مصروف رہا ہوں۔ ہماری کوشش رہی ہے کہ عوام کی بڑھتی ہوئی بیداری کو اس ڈھب پر منظم کر دیا جائے کہ وہ اپنے جائز حقوق اور آزادی کی خواہش کا اظہار نہایت وفادارانہ طریق پر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ مگر حکومت اس سادہ سی بے ضرر اور جائز بات کو بھی برداشت نہ کر سکی۔ اور اس کے تعزیری اور امتناعی قوانین کی مشینری فوراً حرکت میں آگئی۔ جہاں قانون عوام کی مرضی پر مبنی نہ ہو، وہاں یہ اُن کی خواہشات کو کچلنے کے لئے استعمال ہو سکتا ہے! ایسے قانون کے لئے کسی قسم کا اخلاقی جواز نہیں ہوتا، چاہے اُسے کچھ عرصہ کے لئے زبردستی سے بھی نافذ کیوں نہ رکھا جائے، مگر اس سے بھی بڑا ایک قانون موجود ہے۔ جو عوام کی مرضی کی نمایندگی کرتا ہے۔ جس سے جمہور کی بھلائی حاصل ہوتی ہے انسانی ضمیر کے ٹریبونل کے سامنے حکمرانوں اور محکوموں کے اعمال کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔ جہاں انصاف کا معیار زیادہ طاقتور فریق کی دھکڑ شاہی مرضی کے مطابق تبدیل نہیں

ہوسکتا۔ میں اس قانون اور ٹریبونل کے سامنے بڑی خوشی اور اعتماد کے ساتھ بلا جھجک اپنا مقدمہ پیش کرتا ہوں اور اس کا فیصلہ تاریخ اور آئندہ نسلوں پہ چھوڑتا ہوں۔

میں اور میرے ساتھیوں نے جن حقوق کا دعویٰ کیا ہے، وہ صرف ریاست جموں و کشمیر ہی کے چالیس لاکھ باشندوں کی طرف سے نہیں ہے۔ بلکہ ساری ہندوستانی ریاستوں کے نو کروڑ مظلوموں کی آواز بھی اس میں شامل ہے۔ اس میں کسی خاص عقیدہ یا نسل یا رنگ کے لوگوں کی بھی تخصیص نہیں بلکہ ہمیں ناقابلِ تقسیم ساری انسانی برادری کی بھلائی مقصود ہے بحیثیت انسان تمام مردوں اور عورتوں کو آزادانہ زندگی بسر کرنے کے بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے قانون بنانا بلا امتیاز مذہب و ملت تمام انسانوں کا قدرتی حق ہے جس کے جواز سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لئے اُسے دبا کر رکھا جا سکتا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ حکمرانی کا حقیقی حق صرف عوام کو ہی حاصل ہے اور تمام سیاسی۔ اقتصادی اور سماجی تعلقات انہی کی مرضی اور خواہش کے مطابق قائم ہوتے ہیں۔ ریاست اور حکمران دراصل بالترتیب اس حکمرانیت کے سلسلہ میں آئینی دائرہ اور مرکز کا درجہ رکھتے ہیں۔ ریاست کا سربراہ اور اختیارات اور طاقت کا مظہر ہے۔ جو عوام اپنے حقوق و مقاصد کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے اسے تفویض کرتے ہیں۔ جس پہ جا سے ریاست بنتی ہے، اس کو ریاست کے تمام ابتدائی امور اور ذرائع پہ پہلا حق ہونا چاہیئے۔ عوام کی بھلائی کے معاملے میں

کسی خاص گروہ یا اس گروہ کے کسی خاص حصے کا کوئی امتیاز روا نہ رکھنا چاہئے۔ سب کو بالکل مساوی حقوق واختیارات اور مواقع حاصل ہونے چاہئیں کسی مصنوعی بہانہ کی وجہ سے افراد طبقوں اور فرقوں کو ان حقوق سے محروم رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

زمانۂ قدیم سے کشمیر اپنے دلآویز قدرتی مناظر اپنے باشندوں کی پرامن دماغی اور تعلیمی سرگرمیوں اور کاریگری کے لئے مشہور چلا آیا ہے۔ قدرت نے اس خطہ زمین کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اور کشمیر مادر ہندوستان کے تاج میں ایک ہیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر زمانۂ قدیم سے ہی لوگ کشمیر کی طرف کھچے آرہے ہیں یا یہ خطہ زمین دنیا بھر کے لوگوں کے لئے پرکشش رہا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے جو یہاں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ جو کشمیر کی مٹی سے ہی بنے ہیں اور کشمیر کے اناج میووں کو کھا کر اور ٹھنڈے چشموں کا پانی پی کر جوان ہوئے ہیں کے جذبات کیا ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ آج اس سرزمین میں بسنے والوں کو فاقوں اور افلاس کا سامنا ہے۔ ان کے دلوں میں نہ ارمان ہے اور نہ خوشی ہے۔ ان کے چہروں پر پژمردگی چھائی ہوئی ہے لوگوں کی آنکھوں میں نہ نور ہے اور نہ زندگی کی جلا۔ جب ہم کشمیری اس صورت حالات کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں درد و سوز بھر جاتا ہے۔ ہم اپنی حالت پر آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ہمارے دل میں قدرتی طور پر امنگ پیدا ہوتی ہے کہ ہم اپنی حالت کو بدلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور اہل کشمیر کی حالت کو کشمیر کی شایان شان بنا کر دکھائیں۔ ہمارے دلوں کی گہرائیوں کا یہ احساس ہے

کہ ہم مشکلات کے باوجود جاگ اُٹھے ہیں اور اہلِ کشمیر کے دل میں امید پیدا ہو گئی ہے کہ ان کا افلاس ختم ہو سکتا ہے اور مصیبتیں کم کی جا سکتی ہیں! ان حقائق کے مدِ نظر میری جماعت نے کشمیر کی آئندہ حکومت کا ایک خاکہ تیار کیا اس میں لوگوں کے بنیادی حقوق کا چارٹر بھی شامل ہے۔ طرزِ حکومت کو جمہوری بنانے کی تجاویز بھی شامل ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عوام کے حقوق کیا ہوں گے۔ اور اُن کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نئے کشمیر میں سوسائیٹی کا اقتصادی نظام کیا ہوگا۔ اس کا حکمران آئینی حکمران ہوگا۔ میری جماعت نے یہ پروگرام نیا کشمیر کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب جموں و کشمیر کے لوگوں کے بنیادی حقوق اور ذمہ داریوں کا خاکہ ہے۔ اس کو تیار کرتے وقت آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے مطالبات اور پالیسی کو مدِ نظر رکھا گیا۔ مجھے آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کا نائب صدر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور اس کانفرنس کی پالیسی بنانے میں میرا بھی حصہ ہے اور پہلے کی طرح آج بھی میں اس کے مقاصد اور پالیسی سے متفق ہوں۔

سٹیٹس پیپلز کانفرنس واضح الفاظ میں قرار دے چکی ہے کہ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ اور والیانِ ریاست کے معاہدے جاری نہیں رہ سکتے۔ یہ ختم ہونے چاہئیں سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے ریزولیوشن کا والیانِ ریاست اور برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے مابین ایک معاہدہ کی طرح "معاہدہ امرتسر" پر بھی اطلاق ہوتا ہے یہ افسوسناک معاہدہ اس امر کی یادگار ہے کہ کس طرح کشمیر کے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دیا گیا، یا خرید لیا گیا کشمیریوں کو بلا امتیاز اس بات کے

کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان یا سکھ اس بات کا دکھ ہے کہ ان کے ساتھ ایک جنس کا سا سلوک کیا گیا۔ اور جنس کی طرح فروخت کیا گیا۔ اس معاہدہ کا ہی نتیجہ ہے کہ کشمیریوں سے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان آج تک جموں و کشمیر کے معاملات میں ادنیٰ درجہ کے لوگوں کا سا سلوک ہو رہا ہے اور اس امتیازی سلوک کا انہیں سخت افسوس اور رنج ہے۔

ریاستوں کے پرانے معاہدے

یہ بات بالکل واضح تھی کہ ریاستوں کے متعلق پرانے معاہدے بہرحال ختم ہوں گے۔ کیونکہ ان میں اور دورِ جدید میں کوئی مطابقت ہی نہیں۔ ہندوستان اور ریاستوں میں جو تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں، ان معاہدوں کو ان تبدیلیوں کے مطابق نئی شکل دی ہی نہیں جا سکتی۔ ۱۶ مئی کو وزارتی مشن نے جو اعلان کیا اس سے ریاستی باشندوں کی یہ دیرینہ مانگ پوری ہو گئی۔ وزارتی مشن کے اعلان میں صاف طور پہ یہ درج ہے کہ آزاد ہندوستان کا آئین نافذ ہونے ہی ریاستوں پہ برطانوی اقتدارِ اعلیٰ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ وزارتی اعلان پہ عمل درآمد ہونے کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ والیانِ ریاست اور برطانوی حکومت کے معاہدے خود بخود ختم ہو جائیں گے ایسا ہونا قدرتی ہے کیونکہ ہندوستان آزاد ہونے پہ آزاد ہندوستان کے نقشے میں برطانوی حکومت کا نشان نہیں ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ مطالبہ کہ معاہدہ امرتسر منسوخ ہونا چاہیئے۔ وزارتی مشن نے اپنے اعلان میں منظور کر لیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کہ موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد دربارِ کشمیر

ریاستی نظم ونسق کو چلانے کے لئے ایک ایسے معاہدہ کی آڑ لے سکے۔ جو موجودہ نظام کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ 'کشمیر خالی کرو' کا نعرہ لگا کر ہیں نے اس مطالبہ کو ایک نعرہ کی شکل دے دی۔ کہ ریاست کشمیر میں بھی وہ طرزِ حکومت ختم ہونا چاہیئے۔ جو باقی سارے ہندوستان میں ختم ہو رہا ہے۔

یہ ایک معمولی سی بات ہے کہ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ یا مجھ پر مقدمہ چلا کر مجھے قید کر دیا گیا۔ لیکن جموں اور کشمیر کے لوگ غربت۔ ذلت اور پستی کا شکار ہو رہے ہیں، اسے معمولی بات نہیں کہا جا سکتا۔ گذشتہ دو ماہ کے عرصے میں جو سختیاں اور مصائب انہیں برداشت کرنی پڑی ہیں اور اب بھی وہ کر رہے ہیں، البتہ یہ بھی کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ خود ان واقعات نے ہمارے "کشمیر خالی کرو" کے مطالبے کو حق بجانب قرار دے دیا ہے۔ کیونکہ جو نظامِ حکومت اس قسم کی کاروائیاں کرنے کا باعث بنتا ہے۔ وہ قابلِ مذمت ٹھہرایا جاتا ہے۔

اگر میرے یا میرے ساتھیوں کے قید ہو جانے سے اس مقصد کو جس کے لئے ہم نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے، تقویت پہنچتی ہے تو یہ ہمارے لئے بہت اچھا ہو گا اور ہم فخر کریں گے کہ ہم اپنے آبائی وطن اور اس کے لوگوں کی خدمت کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ کشمیر اپنی خوبصورتی اور سابقہ تاریخ وروایات کی وجہ سے ہمیں بہت عزیز ہے۔ لیکن مستقبل ہمیں پکار رہا ہے۔ اور اس کے لئے ہی ہم جد وجہد کر رہے ہیں۔ ایسا مستقبل جو ہم سب کے لئے ایک مشترکہ وراثت چلا آرہا ہے۔ سب مرد عورتیں۔ آزاد انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی آرزوؤں کا نیا کشمیر تصور کریں گے۔ تب ہی ہم

اس کے سچے باشندے کہلانے کے مستحق ہوں گے۔

عدالت کا فیصلہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو لالہ برکت رائے سیشن جج نے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو زیر دفعہ ۱۲۴ (الف) آر۔ پی سی۔ تین سال قید اور ۱۵۰۰ روپے جرمانہ کی سزا دی اور اپنے فیصلہ میں میں لکھا کہ ملزم (شیرِ کشمیر) کی تینوں تقاریر ثابت ہو گئی ہیں۔ اور بصورت عدم ادائیگی جرمانہ ملزم کو تین ماہ قید مزید کاٹنی پڑے گی۔

الغرض معاہدہ امرت سر کو توڑنے کے جرم میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو پس دیوارِ زنداں دھکیل دیا گیا۔ اور اس وقت رہا کیا گیا جب ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ اور ریاست جموں و کشمیر کا مہاراجہ ہندو پاک کی دونوں یونینوں سے جوں کا توں معاہدہ کر کے" اندرونی سازش" میں لگا ہوا تھا۔ شیرِ کشمیر نے جس منحوس معاہدہ کو توڑنے کا وعدہ کیا وہ حسبِ ذیل ہے۔

بیعنامہ امرتسر صلحنامہ جو برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان ۶ر مارچ ۱۸۴۶ء کو امرت سر کے مقام پر طے ہوا۔

یہ صلحنامہ ایک طرف حکومت برطانیہ اور دوسری طرف مہاراجہ گلاب سنگھ آف جموں کے مابین برطانوی حکومت کی جانب سے فریڈرک کیوری اور بریننٹ ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعے رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگس جی۔ سی۔ بی برطانیہ عظمیٰ کا آنریبل پریوی کونسل گورنر جنرل مقرر شدہ آنریبل کمپنی برائے ایسٹ انڈیز کے تمام معاملات کی رہنمائی کرنے اور کنٹرول کرنے کے حکم

اور مہاراجہ گلاب سنگھ کی بہ نفس نفیس موجودگی میں طے پایا

دفعہ ۱

برطانوی حکومت تمام پہاڑی علاقہ معہ تمام آبادی کے ساتھ درمیان سندھ مشرق اور دریائے راوی کے مغرب معہ چنبہ اور بغیر لاہول جو کہ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے لاہور کے صلحنامہ کی دفعہ ۶ کی رُو سے ریاست لاہور کو دے دیا گیا ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کی اولادِ نرینہ کے آزاد قبضے میں تبدیل کرتی ہے۔

دفعہ ۲

خطہ زمین کی مشرقی سرحد کہ جو مندرجہ بالا دفعہ کے ماتحت مہاراجہ گلاب سنگھ کے نام منتقل کیا گیا ہے، برطانوی حکومت اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے اس مقصد کے لئے مقرر کئے ہوئے علی الترتیب کمشران سروے کرنے کے بعد ایک علیحدہ ملاقات میں بنائیں گے۔

دفعہ ۳

مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے وارث کے نام مندرجہ بالا دفعات کی رُو سے انتقال ریاست کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کو ۷۵ لاکھ روپیہ (نانک شاہی)۔ ۵۰ لاکھ اس صلحنامہ کے شروع ہوتے وقت اور ۲۵ لاکھ پہلی اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یا اس سے پہلے دے دیں۔

دفعہ ۴

ان علاقوں کی سرحدیں مہاراجہ گلاب سنگھ کبھی کسی وقت بھی برطانوی حکومت

کی مرضی کے بغیر تبدیل نہیں کر سکیں گے۔

دفعہ ۵

کوئی مسئلہ تنازع جو مہاراجہ گلاب سنگھ اور حکومت لاہور یا اور کسی پڑوسی ریاست کے درمیان اٹھ کھڑا ہو، اُسے طے کرنے کے لئے انہیں حکومت برطانیہ کو ثالث مقرر کرنا ہوگا۔ وہ برطانوی حکومت کے فیصلے کو تسلیم کریں گے

دفعہ ۶

مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے ورثاء اپنی تمام قوت کے ساتھ برطانوی سپاہیوں کو مل جائیں گے۔ جبکہ وہ پہاڑوں پر یا ان کے مقبوضہ علاقوں کے پڑوس میں مصروف ہوں گے۔

دفعہ ۷

مہاراجہ گلاب سنگھ کسی برطانوی باشندے یا یورپین باشندے یا امریکہ کی ریاست کے باشندے کو اپنے یہاں ملازمت کرنے یا خدمت لینے کی غرض سے بغیر برطانوی حکومت کی اجازت سے نہیں رکھیں گے۔

دفعہ ۸

مہاراجہ گلاب سنگھ اس خطہ زمین کے انتقال کے عوض میں جو کہ انہیں ملا ہے، برطانوی حکومت اور لاہور دربار کے درمیان علیحدہ صلحنامہ جو بتاریخ ۱۱ مارچ ۱۸۴۶ء کو ہوا، اس کی دفعہ ۵، ۶ اور ۷ کی عزت کریں گے

دفعہ ۹

برطانوی حکومت مہاراجہ گلاب سنگھ کو بیرونی دشمن حملہ آور سے بچانے

میں اس کی مدد کرے گی۔

دفعہ نمبر ۱۰

مہاراجہ گلاب سنگھ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ اور اس اطاعت کے صلے میں برطانوی حکومت کو ہر سال ایک گھوڑا۔ ۱۲ بکریاں (۴ بکرے۔ ۶ بکریاں) اور تین جوڑے کشمیری شال کے پیش کریں گے۔

یہ صلحنامہ جس میں مندرجہ بالا دفعات شامل ہیں، آج کے روز فریڈرک کیوری اور بریوٹ میجر ہنری منٹگمری لارنس کے ذریعہ رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگس جی۔ سی۔ بی گورنر جنرل کے حکم سے برطانوی حکومت کے اور بہ نفس نفیس مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان طے ہوا۔ اور آج کے روز رائٹ آنریبل سر ہنری ہارڈنگ جی۔ سی۔ بی گورنر جنرل کی مہر ثبت ہو کر منظور ہوا۔

امرت سر میں آج ماہ مارچ کے ۱۶ ویں دن ۱۸۴۶ء عیسوی یعنی ربیع الاوّل کے ۱۷ ویں دن ۱۲۶۲ھ ہجری کو لکھا گیا۔

دستخط و مہر

(دستخط)۔ ایف۔ کیوری ‏ ‏ ‏ ‏ ایچ —— ہارڈنگ

(") ایچ۔ ایم لارنس

مختصراً گذشتہ واقعات سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے ایک مبسوط اور واضح پروگرام کے تحت "کشمیر چھوڑ دو" تحریک شروع کی اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے آئینی

طریق سے جدوجہد کی طرح ڈالی۔ مگر حکومتِ کشمیر نے اس تحریک کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کچل دینا چاہا اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی۔ اگر چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے دُوسرے زعماء جموں میں بھی اس قسم کی تحریک جاری کر دیتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ ڈوگرہ حکومت کا خاتمہ نہ ہوتا مگر مسلم کانفرنس کے زعماء نے اپنی مخصوص مصلحتوں کے پردہ میں ایسے حالات پیدا کر دیئے جنہوں نے ڈوگرہ حکومت کے پاؤں کو مضبوط اور عوامی تحریکوں کے راستوں کو مسدود کر دیا۔ اور اس طرح تحریک حریت کشمیر میں ایسا خلا پیدا ہوا کہ وہ آج تک پُر نہیں کیا جا سکا۔ اگر اس وقت چوہدری غلام عباس اور اُن کی مسلم کانفرنس شیخ محمد عبداللہ کا ساتھ دے دیتی تو آج سرینگر کے قلعہ ہری پربت پر ہلالی پرچم لہرا رہا ہوتا مگر

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے۔
"رہ گئی کس کی جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی"

الحاق کی سازش

الحاق کی سازش

شیرِ کشمیر شیخ محمّد عبداللہ کے مخالفین اور نکتہ چینیوں کا یہ کہنا ہے کہ ریاست جمّوں وکشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کے ذمّہ دار شیخ محمّد عبداللہ ہیں اور اس وقت ریاست جمّوں وکشمیر کا جو حِصّہ آزاد کشمیر کی صورت میں ہے، اس کا سہرا ان کے سَر ہے۔ ان سیاسیئین کا یہ الزام یا دعویٰ کہاں تک درست ہے، اس حقیقت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس مسئلہ کے تمام عناصر کو سامنے رکھیں اور پھر ان اجزائے ترکیبی کو اکٹھا کر کے یہ فیصلہ کریں کہ نکتہ چینیوں کے یہ الزامات۔ واقعات اور حقائق کی روشنی میں کس قدر درست ہیں۔ کہیں یہ بھی ان کی اُسی "مخالفت برائے مخالفت" کی "کتھا" کے راگوں کی بے سُری تانیں تو نہیں جو ان کی مخصوص بڑ بھی ہیں اور روایتی غلط بیانیوں کی تخلیق بھی۔

جس وقت ہندوستان تقسیم ہُوا ایک طرف تمام ریاست جمّوں وکشمیر پہ مہاراجہ ہری سنگھ پوری مطلق العنانی سے حکمران تھا۔ اور دوسری طرف ریاست کے سیاسی

حالات یہ تھے :-

نیشنل کانفرنس اس سیاسی جماعت نے مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف تحریک "کشمیر چھوڑدو" جاری کر رکھی تھی - جس کے نتیجے اس جماعت کے سربراہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ اپنے سینکڑوں سیاسی رفیقوں اور کارکنوں کے پسِ دیوار زنداں تھے -

ب - بخشی غلام محمد اور خواجہ غلام محمد صادق وغیرہ ریاست بدر ہو کر پنجاب و دہلی میں تحریک "کشمیر چھوڑدو" کے حق میں پروپاگنڈا کرنے میں مصروف تھے - ان کشمیری لیڈروں اور کارکنوں کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور دیگر سیاسی جماعتوں کی بلاواسطہ اور بالواسطہ حمایت حاصل تھی -

ج - وادیٔ کشمیر میں خواجہ غلام محی الدین قرہ روپوش ہو کر تحریک کو نہایت کامیابی سے چلا رہا تھا - جس کی سرگرمیوں نے ڈوگرہ سرکار کو سخت پریشان کر رکھا تھا - غرضیکہ نیشنل کانفرنس مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف اندرون اور بیرونِ ریاست برسرِ پیکار تھی اور اس چیز کو مہاراجہ ہری سنگھ نہایت شدت سے محسوس کر رہا تھا - اور چونکہ اس تحریک کو ہندوستان کی سرکردہ سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل تھی اس لیے یہ تحریک ہندوستان کی حدود کو پار کرتی ہوئی بین الاقوامی سطح پر بھی زیرِ غور آنے لگی تھی اور جب مہاراجہ کشمیر نے یہ کہا کہ اس میں کمیونسٹ عنصر کارفرما ہیں - تو اینگلو امریکن سیاست دان بھی اس کے متعلق سوچنے لگے اور اسے خاص اہمیت دینے لگے تھے - جہاں تک تحریک "کشمیر چھوڑدو" میں کمیونسٹ عناصر کی کارفرمائی کا تعلق ہے، مہاراجہ کا یہ الزام بالکل غلط تھا - البتہ اس کا یہ اندیشہ درست تھا کہ اس تحریک کے پسِ پردہ پنڈت جواہر لعل نہرو ہیں -

مسلم کانفرنس تحریک "کشمیر چھوڑدو" کے ابتدائی مراحل میں تو مسلم کانفرنس

نے اس تحریک کی شدت سے مخالفت کی، بلکہ چودھری غلام عباس نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تحریک کمیونسٹوں کے اشاروں پر چلائی جا رہی ہے اور لطف یہ ہے کہ اسی بات کو مہاراجہ ہری سنگھ دہرا رہا تھا۔ بالفاظ دیگر اس وقت مسلم کانفرنس اور مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت اس تحریک کے بارے میں ایک ہی نظریہ رکھتی تھی۔ لیکن جب

---

[1] بعض لوگ اس بارے میں یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ اُس وقت اس تحریک کے متعلق مسلم کانفرنس اور مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کی ہم نوائی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلم کانفرنس کے ایک اہم لیڈر چودھری حمید اللہ خاں مرحوم کے بڑے بھائی چودھری نیاز احمد صاحب حکومت جموں وکشمیر کے چیف سیکرٹری تھے۔ اور ان کے چودھری غلام عباس سے گہرے مراسم تھے۔ بہت ممکن ہے کہ چودھری نیاز احمد کی وساطت سے حکومت کشمیر نے مسلم کانفرنس کے اعلیٰ دماغوں میں یہ بات ڈلوائی ہو۔ اور اس طرح وہ مسلم کانفرنس کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اس بات کے مزید ثبوت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب ۱۵ برس بعد آزاد کشمیر کے صدارتی الیکشن میں چودھری غلام عباس۔ مسٹر کے۔ ایچ خورشید کے مدِمقابل سردار عبدالقیوم خان کی حمایت میں آئے تو چودھری نیاز احمد بھی ان کے مشیر اور رفیق تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے چودھری نیاز احمد خود آزاد کشمیر کی صدارت کے امیدوار تھے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اس وقت حکومت جموں وکشمیر نے مسلم کانفرنس کو اپنی پوشیدہ اغراض کے لیے استعمال کیا اور بدقسمتی سے مسلم کانفرنس اور اس کے بعض لیڈر اکثر ڈوگرہ سرکار کے ہاتھ میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ جب مہاراجہ ہری سنگھ اور پنڈت رام چند کاک نے "کشمیر کو آزاد" رکھنے کا منصوبہ سوچا۔ تو انہی چیف سیکرٹری چودھری نیاز احمد صاحب کے بھائی چودھری حمید اللہ خان نے سری نگر میں یہ نعرہ

تحریک "کشمیر چھوڑ دو" تمام ریاست میں پھیل گئی تو حالات سے جلد متاثر ہونے والے مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے بھی پینترا بدلا اور اپنی خفت مٹانے کے لیے نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں ایک ڈائرکٹ ایکشن تحریک شروع کر دی۔ یہ بات تمام ریاست میں پھیل چکی تھی کہ مسلم کانفرنس نے رام چند کاک کی حکومت کی ہم نوائی کی ہے، اس لیے ڈائرکٹ ایکشن تحریک کامیاب نہ ہو سکی اور چودھری غلام عباس اپنے پانچ سیاسی رفقائے کار کے ساتھ جیل چلے گئے۔

ﮦ مسلم کانفرنس کی مرکزی قیادت کے لیے چودھری حمید اللہ خان اور میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف آپس میں دست و گریباں ہو گئے اور اس کی رُو سے جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔

ر مسلم کانفرنس کی تنظیم کا یہی حشر صوبہ جموں میں بھی ہوا۔ اور اس کی جماعتی سرگرمیاں "اُردو بازار" کے ایک "بالاخانہ" سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جموں اور کشمیر کے مسلمان جو مسلم کانفرنس سے وابستہ تھے انتشار میں مبتلا ہو کر اپنی اپنی ڈفلی بجانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو حکومت ان کے اس ڈرامے سے متاثر ہوئی اور نہ مسلم لیگ ہائی کمان نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اور نہ کشمیری ذہنوں نے اس تحریک کو، جو اُن کے نزدیک بے وقت کی راگنی تھی، قبولا بلکہ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ جموں کے

بلند کیا کہ کشمیر آزاد و خود مختار ہو گا۔ اور پاکستان سے الحاق نہیں کرے گا۔ ازاں بعد چودھری حمید اللہ صاحب حکومتِ پاکستان کے خلاف (چودھری غلام عباس کے کہنے پر) تقریر کرنے کے جُرم میں آزاد کشمیر کی وزارت سے معزول کر دیئے گئے۔ اور پھر یہی روگ اُس سادہ دل انسان کی علالت کا موجب بنا اور آخر اُس جان ہار نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی ؂

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

مسلمان مہا سبھائی اور سیوک سنگھی ہندوؤں کے نرغے میں آ گئے اور یوں جموں و کشمیر حکومت کو سیاسی میدان بالکل صاف مل گیا۔

مہاراجہ کشمیر تحریک "کشمیر چھوڑ دو" میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا جو رویہ رہا تھا، اس سے مہاراجہ ہری سنگھ بہت نالاں اور بیزار تھا اور وہ ذاتی طور پر اس کے مخالف تھا کہ جواہر لعل نہرو سے کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ ہو۔ اس صورتِ حال نے اس کو پریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ وی۔ پی۔ مینن سیکرٹری وزارت ریاستی امور بھارت کا یہ کہنا درست ہے۔

"بے چارے مہاراجہ مجبور تھے"

اس مجبوری کی وضاحت مسٹر وی۔ پی۔ مینن یوں کرتے ہیں:۔

"مہاراجہ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ جس صورتِ احوال میں گھرے ہوئے تھے، اس کے پیشِ نظر کسی فیصلے تک پہنچنا آسان بھی نہ تھا۔ اگر وہ پاکستان کے ساتھ الحاق کرتے تو جموں کے ہندو، لداخ کے بدھ، اور خود بہت کافی تعداد میں وہ مسلمان جو نیشنل کانفرنس سے وابستہ تھے، اس اقدام پر برہم ہو جاتے۔ دوسری طرف اگر ہندوستان سے الحاق کرتے تو اس کا ردِ عمل گلگت اور پاکستان کے ملحقہ علاقوں میں بہت سخت ہوتا۔"

ان حالات میں انہوں نے برطانوی حکومت کے علاوہ لارڈ لوئی مونٹ بیٹن سے بھی بات چیت کی مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاراجہ کشمیر کی اس گومگو کی پالیسی کے کارن پنڈت رام چندر کاک بھی کوئی سمجھوتہ نہ کر سکے اور انہوں نے کسی بھی حکومت سے الحاق کی حامی نہ بھری۔ حالانکہ بھارتی حکومت نے ان کو ہر طریق سے رام کرنے کی کوشش کی اور بقول مسٹر وی۔ پی۔ مینن ـــــ

"بھارت کی وزارتِ امورِ ریاست جب قائم ہوئی تو ہم نے ان والیانِ ریاست اور ان کے مشیروں سے الحاق کی ابتدائی گفت گو شروع کر دی، جن کی ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان سے ملی ہوئی تھیں۔ پنڈت رام چند کاک کشمیر کے وزیرِ اعظم اُس وقت دہلی میں مقیم تھے۔ مہاراجہ پٹیالہ کی تجویز پر ہم نے اپنے ایک اجتماع میں انہیں مدعو کیا، لیکن وہ شریک نہ ہوئے بعد میں میری اُن سے گورنر جنرل ہاؤس میں ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے دریافت کیا یہ تو بتائیے کہ مہاراجہ ریاست کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے؛ لیکن انہوں نے کھُل کر بات نہ کی۔ وہ ٹال گئے۔ کاک کی سردار پٹیل سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ نہ یہ شخص میری سمجھ میں آسکا، نہ اس کی گہرائی کا مجھے اندازہ ہو سکا۔ بعد میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کاک اور جناح کے مابین ملاقات کا انتظام کیا۔"

دہلی میں مسٹر رام چند کاک وزیرِ اعظم ریاست جموں و کشمیر کی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی ملاقات ہوئی۔ جس میں یہ طے پایا کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان کے ساتھ "جوں کا توں" معاہدہ کرے گی اور بعد ازاں ریاست کے اندرونی حالات کی درستی کے بعد الحاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو حکومتِ کشمیر نے حکومتِ پاکستان کو ایک تار بھیجا، جس میں مذکور تھا کہ ریاست حکومتِ پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہے اور درخواست کی کہ حکومتِ پاکستان ریاست جموں و کشمیر کے لیے وہ تمام مراعات اور سہولتیں بحال رکھے جو پہلے تھیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے اس تار کا جواب دے دیا گیا، جس میں مہاراجہ کو کہا کہ حکومتِ پاکستان نے اس کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ اور برطانوی عہد کی تمام مراعات

بحال رہیں گی۔ حکومتِ کشمیر نے اس قسم کا ایک تار بھارت سرکار کو بھی دیا، مگر بھارت نے یہ جواب دیا کہ ریاست کے معاملات پر غور و غوص کے بعد جواب دیا جائے گا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بھارت کی نیت میں پہلے ہی دن سے فتور تھا۔ اُس وقت شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ جیل کی تنہائیوں میں اِن حالات سے بے خبر پڑے تھے۔ اسی دوران میں مہاراجہ کشمیر نے لارڈ لوئی مونٹ بیٹن سے طویل ملاقاتیں کیں۔ اور بقول مسٹر وی۔پی مینن:

"لارڈ مونٹ بیٹن کے مہاراجہ کشمیر سے پُرانے تعلقات تھے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز نے جب ہندوستان کا دورہ کیا تو یہ لارڈ مونٹ بیٹن اُن کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ کشمیر نے اسی زمانہ میں اُنہیں کشمیر آنے کی دعوت دی تھی، وہ دعوت اب انہوں نے قبول کی اور جون کے تیسرے ہفتے وہ کشمیر گئے۔ اور وہاں وہ مہاراجہ سے صورتِ حالات پر گفتگو کرتے رہے۔ انہوں نے مہاراجہ کو بتایا کہ کوئی ریاست بھی اب آزاد اور خود مختار نہیں رہ سکتی[۱]۔ نہ برطانوی حکومت اُسے ایک ڈومینین کی حیثیت سے تسلیم کرے گی۔ انہوں نے مہاراجہ کو یقین دلایا کہ جب تک وُہ یہ فیصلہ نہ کر لیں کہ انہیں ہندوستان یا پاکستان میں سے کس کے ساتھ الحاق کرنا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں سے کوئی حکومت بھی اگر کشمیر کو اپنی حفاظت میں لے لے تو بعد میں کوئی قباحت پیدا نہیں

۱؎ انہی دنوں کشمیر کے سرکاری حلقوں اور مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے یہ بات پھیلائی — کہ ریاست جموں و کشمیر آزاد و خود مختار رہے گی۔ (مصنف)

ہو گی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ پاکستان سے الحاق کر لیں، تو ہندوستان قطعاً بُرا نہیں مانے گا۔ یہ بات انہوں نے اپنی طرف سے بھی کہی، اور سردار پٹیل کی طرف سے بھی اس بات کی یقین دہانی کرائی ۔۔۔"

آگے چل کر مسٹر وی۔ پی مینن لکھتے ہیں کہ:

"مگر ـــــ مہاراجہ قطعاً" یہ فیصلہ کرنے کے نااہل ثابت ہوئے"۔

کیونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں یہ بھی کہا تھا ـــ

"کشمیر میں آبادی کا جو فرقہ دارانہ تناسب ہے اُسے پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ الحاق کے سلسلہ میں عوام کے جذبات اور رجحانات کا خیال بھی رکھا جائے"۔

مگر مہاراجہ ایسا نہ کر سکے، کیونکہ:

"انہوں نے تو شیخ چلی کا دماغ "Micawhish frame of mind." پایا تھا۔ کچھ نہ کرنا اور بہترین کی توقع کرنا ان کا اصول تھا۔ علاوہ ازیں وہ جموں وکشمیر کی آزادی وخودمختاری کا خواب بھی دیکھ رہے تھے"۔ (وی۔ پی۔ مینن)

یہ تمام واقعات اِن قرائن کی تصدیق کرتے ہیں کہ مہاراجہ ریاست جموں وکشمیر کو آزاد و خودمختار دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ بلکہ اب یہ کہنا درست ہے کہ انہوں نے ذاتی طور پر کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کو شدت سے محسوس کیا اور جب کشمیر پہ بھارت کی گرفت مضبوط ہوئی، تو وہ ریاست چھوڑ کر چلے گئے۔ اور بھارت کی دھرتی کے خلاف

ان کی نفرت یہاں تک بڑھی کہ مرتے وقت یہاں تک کہہ دیا کہ:

"میری لاش کے 'پھولوں' کو گنگا جمنا کے سپرد نہ کرنا، بلکہ جموں وکشمیر کی فضا پر بکھیر دینا۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی لارڈ ماونٹ بیٹن جس نے مہاراجہ کشمیر کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان سے ریاست کے الحاق کے معاملہ میں بھارت مداخلت نہیں کرے گا، الحاق کے بارے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہی بنا۔ اور مہاراجہ کی حکومت نے جس مملکت سے 'جوں کا توں' معاہدہ کیا تھا، اُسی کی جانب سے جب ریاست پر قبائلی مجاہدین کی یلغار ہوئی، تو مہاراجہ دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اور بدقسمتی سے اس کا نزلہ جموں شہر کے لاکھوں بے گناہ اور معصوم انسانوں پر گرا اور وہ بڑی بے دردی سے مارے گئے، اور جو بچے وہ تباہ و برباد ہوئے اور جموں شہر میں ہر طرف آگ و خون کے دریا بہنے لگے۔ اور دہلی میں مہاراجہ ہری سنگھ کے نام پر ریاست کے الحاق کی یادداشتیں تیار کی جانے لگیں۔ درحقیقت یہ سب کچھ بہت پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔ جس کا علم نہ تو مہاراجہ ہری سنگھ کو تھا، نہ شیخ عبداللہ کو اور نہ ہی پاکستان کو۔ مہاراجہ ہری سنگھ تو حالات سے اتنا نالاں تھا کہ اُس نے اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو یہاں تک کہہ دیا کہ جب کشمیر پر حملہ آور قابض ہو جائیں "تو مجھے گولی سے اُڑا دینا۔ اور یہ کہہ کہ وہ سو گیا تھا۔"[1] مگر عین وقت پر بھارت کے طیارے پہنچ گئے اور ریاست جموں وکشمیر آزاد ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس موقع پر بھارت نے اُس مہرے کو آگے کر دیا، جسے رام سوامی آئینگر کے نام سے دُنیا جانتی تھی۔ اور جس نے کشمیریوں کی قسمت کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا اور بقول مسٹر سٹیفنز ایڈیٹر سٹیٹسمین کے :-

[1] وی۔ پی۔ مینن

"یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوا۔ جب ستمبر میں مَیں نے یہ خبر پڑھی کہ مسٹر گوپال سوامی آئنگر جو ایک باصلاحیت مدراسی برہمن اور مسلمانوں کی دشمنی کے لیے مشہور تھا۔ وہ ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۳ء تک وزیرِ اعظم کشمیر رہ چکا تھا۔ بھارت کی پہلی کابینہ میں وہ وزیر بے محکمہ بنایا گیا ہے اُس وقت میں کلکتہ میں تھا۔ میں نے اپنی ایڈیٹوریل کانفرنس میں اس خیال کا اظہار کیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کشمیر میں کوئی سخت قدم اُٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اخبار کے نامہ نگاروں کو ہدایت کر دی گئی کہ کشمیر کے متعلق خبروں کا خاص خیال رکھیں۔ اس سے پہلے بھی بعض ایسی باتیں تھیں، جن سے اِن رجحانات کا پتہ چلتا تھا۔ مثلاً تقسیم سے قبل آچاریہ کرپلانی بار بار کشمیر گئے۔ مشرقی پنجاب کے بعض مہاراجے اور خود گاندھی جی کشمیر گئے۔ اب گاندھی جی ایک طرف تو مہاتما تھے لیکن دوسری طرف وہ ایک عیّار سیاست دان بھی تھے۔"

(ہارنڈ مون)

گوپال سوامی آئنگر غرضیکہ بھارت نے رام سوامی آئنگر کو ابتدا ہی میں کشمیر کے متعلق اپنا مشیر چُنا، اور اُس نے جس عیاری سے کشمیری عوام کو دھوکا اور عالمی رائے عامہ کو فریب دیا، وہ "ابلیسی سیاست" کا ایک شاہکار ہے۔ اِسی وجہ سے آئنگر کی موت پر بھارت کے وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے کہا۔ "مرحوم میرے ایک ایسے عزیز اور قابلِ قدر رفیقِ کار تھے، جن کی پختگیٔ عقل نے ہر مشکل میں ہماری امداد کی۔" (نہرو۔ ماہ نامہ "آجکل" اپریل ۱۹۵۳ء)

اور پھر بقول "آجکل" یہ وہی رام سوامی آئینگر ہیں ۔

"جنھوں نے کرپس مشن کی آمد پر مشن کے سامنے ریاستوں کی خود مختاری کی شدّ و مدّ سے مخالفت کی اور انڈین یونین کی وحدت کے نقطۂ نگاہ کی حمایت کر کے ان تنگ نظر سیاست دانوں کی مخالفت کی جو ہندوستان کو کئی خود مختار حصّوں میں بانٹ دینا چاہتے تھے ۔"

بھارت کی طرف سے کشمیر کو پاکستان کے "زرغے" سے بچانے کے لیے جو کردار سامنے آئے وہ یہ ہیں :

۱- مہاتما گاندھی بوساطت مہارانی کشمیر اور سوامی مہاراجہ کشمیر ۔

۲- لارڈ لوئی مونٹ بیٹن گورنر جنرل بھارت بوساطت مہاراجہ کشمیر ۔

۳- سردار پٹیل - مسٹر وی پی مینن - مسٹر رام سوامی آئینگر بوساطت وزارت اُمورِ ریاست بھارت سرکار ۔

۴- مہر چند مہاجن وزیرِ اعظم کشمیر بوساطت باؤنڈری کمیشن ۔

۵- پنڈت جواہر لعل نہرو بوساطت افواج اور سیاسی عیاری ۔

جیسا کہ اُوپر ذکر ہُوا ہے وہی لارڈ مونٹ بیٹن جس نے مہاراجہ کشمیر کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ کشمیر کے الحاق کے بارے میں مداخلت نہیں کریں گے ۔ مسئلہ کشمیر کے پیدا ہوتے ہی پاکستان کے سب سے بڑے مخالف بن گئے ۔ اور بقول مسٹر اسٹیفنز ایڈیٹر سٹیٹسمین کے :-

"ستمبر میں ایک دوسری نوعیت کا واقعہ پیش آیا ۔ مستند حلقوں سے ایسی خبریں رفتہ رفتہ ہم تک پہنچنے لگیں کہ ریاست کشمیر کے جنوب مغربی

کوہستانی علاقہ میں پونچھ کے اِرد گرد کے جنگجو مسلمان کاشت کاروں نے جن میں زیادہ تر فوج سے سبکدوش شدہ لوگ تھے بغاوت کر دی ہے انہوں نے مہاراجہ کے افسروں کے ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کی تھی - ایک زمانہ تھا کہ خود کانگرسی بھی اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے تھے - یہ بغاوت بے حد اہم تھی ؂ (ہارنڈمون)

اِنہی دنوں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ بھی رہا ہوتے ہیں - انہوں نے ان حالات کو دیکھ کر کہا :-

"صرف پونچھ میں اسّی ہزار سابق فوجی ہیں - وہاں کے عوام نے ڈوگرہ مظالم کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کر دیا ہے اور یہ سابق فوجی اپنے بیوی بچّوں کو ریاست سے ملے ہوئے پاکستانی علاقے میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیج کر خود ہتھیار بند ہو کر میدان میں اُتر آئے ہیں - انہوں نے ڈوگروں سے ہتھیار چھین کر اپنے آپ کو مسلح کر لیا ہے - اس تحریک میں فرقہ پرستی کا شائبہ تک نہیں ؂"

مگر جموّں شہر کے فرقہ پرست ہندوؤں پر اس کا ردِّ عمل کیا ہوا ، اِس کی کہانی "ہارنڈمون" کے مصنف کی زبان سے سُنیئے :-

"پونچھ کے ہنگاموں کی خبروں کے ساتھ ساتھ مشرقی جموّں کے اِردگرد کے علاقوں سے بھی خبریں آنے لگیں - اس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت غالب نہیں تھی - سکھوں اور ہندوؤں نے مہاراجہ کے افسروں کی ہمت افزائی سے مسلمانوں کو دہشت زدہ اور قتل کرنے کی مہم شروع

کردی اور وہاں سے مسلمان بھاگنے لگے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ حالات کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ میں دہلی کے دفتر میں منتقل ہو جاؤں۔"

اس کے بعد مسٹر اسٹیفنز لکھتے ہیں :-

"چند دنوں بعد ڈکوٹہ طیاروں کے ذریعہ فوجیں جس تیزی کے ساتھ اور منظم طور پر سری نگر بھیجی جارہی تھیں، اس سے مجھے حیرت ہوئی کہ اعلیٰ پیمانہ پر طیاروں سے فوجیں بھیجنے کے اس منصوبہ پر کس طرح اچانک عمل کیا گیا - میں ۱۹۴۲ء میں یورپ میں جنگی نامہ نگار رہ چکا ہوں، اس لیے جانتا ہوں کہ ایسی کارروائی میں کیا کیا دشواریاں پیش آتی ہیں - ۲۶ راکتوبر کی شام کو جب کشمیر میں پٹھانوں کے حملے کی خبریں گشت کر رہی تھیں، لارڈ ماونٹ بیٹن نے مجھے ڈنر پر بلایا، چند افراد وہاں اور موجود تھے ———————— اور یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ لارڈ ماونٹ بیٹن یک طرفہ خیالات کا اظہار کر رہے تھے - میں نے اپنی ڈائری میں یہ رائے قلمبند کی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندو پرست اور ہندو نواز ہو گئے ہیں - گورنمنٹ ہاؤس کی فضا سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ لڑائی شروع ہو چکی ہے - پاکستان مسلم لیگ اور مسٹر جناح دشمن تھے۔"

"کھانے کے بعد لارڈ ماونٹ بیٹن مجھے علیحدہ لے گئے - ایک اہم اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مجھے حالات کی صحیح واقفیت بہم پہنچانی ضروری تھی - انہوں نے بتایا کہ پٹھانوں کے حملہ کے سبب ہندوستان

میں مہاراجہ کی شمولیت کی دستاویز تیار کی جارہی ہے - اس سے ریاست کے مسلمان باشندے ہمیشہ کے لیے قانونی طور پر ہندوستان کے شہری بن جائیں گے اور یہ ریاست پھر کبھی مسٹر جناح کو نہ مل سکے گی ۔"

دستاویزات

مسٹر سٹیفنز ایڈیٹر سٹیٹسمین اور مصنف کتاب "ہارنڈ مون" نے الحاق کی جس دستاویز کا ذکر کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے :-

مائی ڈیئر ماؤنٹ بیٹن!

میں جنابِ والا کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میری ریاست میں شدید ہنگامے برپا ہو گئے ہیں جن کے لیے مجھے آپ کی فوری مدد کی ضرورت ہے - جیساکہ جنابِ والا آگاہ ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر نے ہندوستان یا پاکستان کسی ایک سے بھی الحاق نہیں کیا ہے جغرافیائی لحاظ سے میری ریاست دونوں ہی مملکتوں سے ملحق ہے - اور دونوں ہی کے ساتھ اُس کے اقتصادی وسماجی رشتے ہیں - علاوہ ازیں میری ریاست کی سرحدیں رُوس اور چین سے بھی ملتی ہیں، جسے اپنے خارجہ تعلقات کے لیے ہندوستان اور پاکستان دونوں مملکتیں بھی نظرانداز نہیں کرسکتیں -

مجھے یہ فیصلہ کرنے کے لیے وقت درکار تھا کہ میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کروں یا پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھوں - چنانچہ میں نے دونوں مملکتوں سے جُوں کے تُوں معاہدوں کی درخواست کی، جسے پاکستان نے منظور کرلیا - لیکن ہندوستان نے میری حکومت کے

نمائندہ سے مزید گفتگو کی ضرورت محسوس کی۔ جس کا مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر میں انتظام نہ کر سکا۔ بہرحال اس معاہدے کی رُو سے حکومتِ پاکستان ریاست کے تار اور ڈاک کا انتظام کر رہی ہے۔ اگرچہ ہم پاکستان کے ساتھ معاہدہ کر چکے ہیں، لیکن اس حکومت نے دباؤ کے ساتھ گلا گھونٹنا شروع کر دیا ہے خصوصاً اشیائے خورد و نوش۔ نمک اور پیٹرول کی سپلائی بند کر دی ہے۔

آفریدی، سادہ لباس میں ملبوس سپاہی اور جدید اسلحہ سے لیس لوگوں کو ریاست میں ٹرکوں کے ذریعہ داخلہ کی اجازت دی گئی، جو آغاز میں پونچھ پہنچے۔ پھر سیالکوٹ اور آخر ضلع ہزارہ سے ملحق علاقے رام کوٹ کی جانب گروہ در گروہ پہنچتے گئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ محدود شمار کی ریاستی فوج کے سپاہی تتر بتر ہو گئے اور دشمن سے ایک ہی وقت میں کئی مقامات پر مقابلہ کرنا پڑا۔ اب جان و مال کی تباہی اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے کوئی راستہ نہیں۔ مہورا کا بجلی گھر جو تمام سری نگر کو بجلی سپلائی کرتا ہے، تباہ کر دیا گیا ہے۔ مغویہ اور عصمت دریدہ عورتوں کی تعداد مجھے خون کے آنسو رُلا رہی ہے۔ وحشی قوتیں جو میری ریاست کے اندر داخل کی گئی ہیں، میرے گرما کے دارالحکومت سری نگر کی جانب تیزی سے اس مقصد کے ساتھ بڑھ رہی ہیں، کہ پُوری ریاست پر قبضہ کیا جا سکے۔

شمال مغربی سرحد کے دُور دراز علاقوں سے قبائلیوں کا خاصی تعداد میں

داخلہ ٹرکوں کے ذریعے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے، جو مانسہرہ مظفرآباد روٹ کے راستے آتے ہیں۔ ان کے پاس جدید قسم کا اسلحہ ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ صوبہ سرحد اور حکومتِ پاکستان کے علم میں ہے۔ باوجودیکہ میری حکومت نے ان حملہ آوروں کو روکنے کی متعدد اپیلیں کیں، لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ ریڈیو پاکستان اور پاکستان پریس دونوں ہی نے ان واقعات کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان ریڈیو نے تو ایک کہانی بھی گھڑی ہے کہ کشمیر میں ایک عارضی حکومت قائم کر لی گئی ہے میری ریاست کے ہندو اور مسلمان دونوں ہی نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

موجودہ صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ میں ہندوستان کی مملکت سے مدد طلب کروں۔ لازمی طور پر مجھے یہ مدد اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک میری ریاست ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ نہیں کر لیتی۔ چنانچہ میں نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اس خط کے ہمراہ الحاق کے کاغذات آپ کی حکومت کی منظوری کے لیے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ میرے لیے دوسرا راستہ ریاست کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کا ہے۔ کوئی مہذب حکومت اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی اور میں اس راستہ پر اس وقت تک چلوں گا جب تک میں ریاست کا حکمران ہوں۔ میں جنابِ والا کو مطلع کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا ارادہ ہے، کہ فوری طور پر عارضی حکومت قائم کر دوں۔ اور شیخ عبداللہ سے کہوں

کہ وہ میرے وزیر اعظم کے ساتھ مل کر اس ہنگامی حالت میں فوری طور پر ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اگر آپ میری ریاست کو بچانا چاہتے ہیں تو سری نگر میں فوری مدد درکار ہے۔ مسٹر مینن تمام صورتِ حال سے آگاہ ہیں۔ اگر مزید کسی استفسار کی ضرورت ہو تو وہ یہاں کر سکتے ہیں۔ یہ تحریر بہت جلدی میں لکھی گئی ہے۔

بصد احترام

محل جموں   آپ کا مخلص

۲۶ر اکتوبر ۱۹۴۷ء   ہری سنگھ

چونکہ اس اہم یادداشت کی تیاری میں مسٹر وی۔ پی مینن کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس لیے وہ عجلت میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنا نام ہی لکھ گئے۔ حالانکہ اس وقت وہ خود بھارت کے سیکرٹری تھے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ خط خود کشمیر سرکار کا کوئی کارندہ لے جاتا۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے اس خط کا جواب یُوں لکھا ـــــــ

میرے پیارے مہاراجہ صاحب!

مسٹر وی پی مینن نے آپ کا خط مؤرخہ

۲۶ر اکتوبر مجھے دیا۔

اِن خصوصی حالات میں جو آپ نے بیان فرمائے، میری حکومت نے آپ کی ریاست کا الحاق ہندوستان سے قبول کر لیا ہے۔ ہماری پالیسی کے پیشِ نظر کہ جس ریاست کا الحاق متنازعہ فیہ ہو، اُسے عوام کی خواہشات کے مطابق طے ہونا چاہیئے۔ میری حکومت یہ چاہتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں نظم و نسق کی بحالی اور ریاست کو حملہ آوروں

سے پاک کرنے کے بعد الحاق کا مسئلہ عوام کی کانفرنس پر چھوڑ دیا جائے گا۔ اس اثنا میں آپ کی اپیل پر ہندوستانی فوج کے دستے آپ کی فوج کی امداد کے لیے جو آپ کے علاقہ کی حفاظت کر رہی ہے اور آپ کے عوام کی عزت اور مال کی محافظ ہے، بھیجنے کے لیے آج عمل شروع ہو گیا ہے۔ میری حکومت اور میں مطمئن ہیں کہ آپ نے شیخ عبداللہ سے عارضی حکومت قائم کرنے کے لیے کہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو آپکے وزیرِ اعظم کے ساتھ مِل کر کام کریں گے — بصد احترام

میں ہوں آپ کا مخلص مونٹ بیٹن آف برما

بالآخر بھارتی افواج کشمیر پہنچ گئیں اور وہاں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان یادداشتوں میں شیخ عبداللہ کی تقرری اور استصوابِ رائے کا جو ذکر کیا گیا تھا، وہ سب ایک سیاسی سٹنٹ تھا۔ جس کو نہرو نے خوب اُچھالا، اور شیخ محمد عبداللہ نے خلوص سے اُس پر اعتبار کیا اور اس طرح انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدورمات۔ یہ سب چکّر پنڈت نہرو نے حالات کو قابو میں کرنے کے لیے چلایا تھا۔ بلکہ جنگ کے دِنوں میں جب بریگیڈیئر عثمان کو بھارتی افواج نے خوب اُچھالا تو بقول میجر خزاں سنگھ :-

"مانا کہ کشمیر کی اس لڑائی میں ہمارے ساتھ ایک مسلمان افسر (بریگیڈیئر عثمان) کا نام پبلسٹی کے نکتۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ اور خاص طور پر اب جبکہ یو۔ این۔ او میں یہ مسئلہ پیش ہو رہا ہے، یہ نام ہمارے لیے اور بھی مفید ثابت ہو گا، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم اس

وقت جنگ میں ہیں۔ اور یہ لڑائی مسلمانوں کے ساتھ ہے۔"

(از کتاب "کشمیر اداس ہے")

اس نظریہ کو لے کر بھارت، کے سیاسئین اور فوجیوں نے مسلمانوں کے ناموں کو اچھالا اور بقول مصنف (ہارنڈمون) لارڈ لوئی مونٹ بیٹن نے کہا۔

"اگرچہ اس یادداشت میں استصواب رائے کی شرط رکھی جائے گی۔ پاکستانیوں نے جوناگڑھ کی شمولیت منظور کرنے کی حماقت کی ہے۔ ہندوستانی فوجوں کو فوراً بذریعہ طیارہ کشمیر میں اتارا جائے گا۔ انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ کشمیر کو قبائل سے بچانے کی واحد صورت یہی ہے۔ انہوں نے کہا یہ نہرو کی بلند ہمتی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے استصواب رائے کی شرط منظور کر لی ہے۔ غیر مشروط شمولیت بھی ہو سکتی تھی۔"

آگے چل کر مسٹر اسٹیفنز لکھتے ہیں :۔

"لارڈ مونٹ بیٹن اور سردار پٹیل سے ملاقات کے بعد میں نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ ان کی بات چیت سے پتہ چلتا تھا کہ ریاستوں کے متعلق بھارت کی پالیسی کسی اُصول پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ بھارت نے اوّل جوناگڑھ کی اقتصادی و فوجی ناکہ بندی کی۔ اور پھر کشمیر پر فوج کشی کر دی حالانکہ پٹھانوں کے حملے سے پہلے ہی پونچھ میں خونریزی ہوئی تھی۔ مہاراجہ کی ریاستی فوجوں اور پولیس نے ظلم کیا تھا اور کسانوں نے بغاوت کر دی تھی جس سے ہندوستانی کانگرسیوں کو ہمدردی کرنی چاہیئے تھی پٹھانوں کے حملے سے زیادہ اِن ہنگاموں میں انسان مارے گئے تھے۔ مواصلات

کی دشواری سے اتلافِ جان کا صحیح اندازہ لگانا دشوار تھا۔ جموں کے اردگرد مہاراجہ کی رضامندی سے مسلمانوں کا قتلِ عام پٹھانوں کے حملہ سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اور یہ سب اسی سازش کی کڑیاں تھیں جن میں آئینگر کا تقرر اور رام چند کاک کی برطرفی شامل ہے۔"

شیرِ کشمیر کا "رول"

ان تمام واقعات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس سازش میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ بلکہ جب اس سازش کے تانے بانے بُنے جا رہے تھے، تو اُس وقت شیخ عبداللہ جیل میں تھا اور جیسے ہی وہ رہا ہوئے، اُن کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح جموں و کشمیر کے باقی ماندہ مسلمانوں کو بچایا جائے، اور اُن کا وہ حشر نہ ہو، جو جموں کے صوبے میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔ اُس وقت اُن کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود کو حالات کے سپرد کرتے، اور کشمیر کے مسلمانوں کا جموں کے مسلمانوں کی طرح کشت و خون نہ ہونے دیتے۔ اب ایک طرف انھوں نے یہ کیا، اور دوسری طرف برابر پنڈت نہرو کو استصوابِ رائے کی یاد دہانی کرائی۔ بلکہ ایک موقع پر یہاں تک کہہ دیا۔

"مجھ پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں نے بھارت سے کشمیر کے الحاق کے وعدہ یا ضمانت کی خلاف ورزی کی ہے۔ لیکن میں اپنی تمام قوت سے جو میرے قبضہ میں ہے، اس الزام کو جھٹلا کر بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس ضمانت کی خلاف ورزی کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ کسی اور پر ڈالی جائے۔ کیونکہ یہ خلاف ورزی یک طرفہ امر نہیں ہے کشمیر

کے الحاق کے لیے ہندوستان اور کشمیر کی حکومتوں نے چند ذمہ داریوں کو تسلیم کیا تھا لیکن مقام افسوس ہے کہ ہندوستان کی حکومت نے اپنی ذمہ داریوں کے تسلیم شدہ حصوں کا احترام نہیں کیا۔ باوجودیکہ کشمیر کی حکومت (عبداللہ گورنمنٹ) نے کئی بار ان کو ایسا کرنے کی یاددہانی کرائی۔ اب اگر مجھ پر وعدہ توڑنے کا الزام عاید کیا گیا ہے، تو مجھے بھی یہ سوال کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ وہ وعدے وہ یقین دہانیاں اور ذمہ داریاں حکومتِ ہند کی کہاں گئیں، جو حکومتِ کشمیر سے قبائل کے حملہ سے لے کر میری ۱۹۵۳ء کی حکومت تک کی گئی تھیں۔"

شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ نے پنڈت نہرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

"پنڈت جی!

نومبر ۱۹۴۷ء کے ایک عوامی اجتماع لال چوک سری نگر میں میری آپ کی حمایت کرنے کو تو خوب پبلسٹی دی گئی مگر آپ کو اور اہلِ عالم کو یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ آپ نے اسی جلسہ میں حکومتِ بھارت کی پالیسی کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا :

"یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کشمیر کی جدوجہدِ آزادی کشمیری عوام کی حملہ آوروں کے خلاف ایک مقبول قیادت کے زیرِ نگران ہے اور ہم اس آڑے وقت پر آپ لوگوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ ہماری فوجیں صرف آپ کو حملہ آوروں سے محفوظ کرنے کے لیے آئی ہیں، جتنی جلدی کشمیر حملہ آوروں سے خالی ہو گیا اسی وقت ہماری فوجیں

یہاں سے چلی جائیں گی کیونکہ اس وقت ان کی یہاں پر کوئی ضرورت نہیں ہوگی - اور پھر تم لوگ آزاد ہوگے کہ اپنے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق سنوارو۔"

اور پھر اسی لال چوک کے اسی جلسے کی تقریر سے چند روز پہلے ۲ر نومبر ۴۷ء کو کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا:

"ہم اتنے بے قرار نہیں ہیں کہ اس ابتری اور انحطاط کے وقت کسی چیز کو اختتام پذیر کریں، جب تک ہم خود کشمیری عوام کو یہ موقعہ نہ دیں کہ وہ خود کیا کہنا چاہتے ہیں - کیونکہ یہ اُن ہی پر منحصر ہے کہ ان کو کیا کرنا ہے - یہاں پر میں پھر اس بات کی صاف طور پر وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ریاستوں کے الحاق کے جھگڑے کے بارے میں ہماری ہمیشہ یہی پالیسی رہی ہے کہ الحاق صرف عوام کی مرضی اور منشا کے مطابق ہو اور یہ پالیسی کشمیر کے الحاق کے لیے بھی ہے لیکن جب ہندوستان کا آئین پایۂ تکمیل کو پہنچا تو اس وقت بھی ریاست کو سوائے چند اُمور کے جن میں دفاع اُمورِ خارجہ اور مواصلات شامل تھے، آزادانہ درجہ دیا گیا - (دفعہ ۳۷۰ بھارتی آئین) یہ ایک اور وعدہ خلافی تھی، اور اب کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ تمام یقین دہانیاں اور وعدے کہاں گئے - ؟ اور پہلے کس نے ان عہد و پیمان کو توڑا ؟ ان سب چیزوں کے علاوہ میری وزارتِ عظمیٰ سے غیر آئینی برطرفی اور بغیر مقدمہ چلائے طویل اسیری - ان وعدوں اور عہد و پیمان

سے انحراف کی روشن مثالیں ہیں، جو زبانِ حال سے آپ لوگوں کی غلط فہمیوں کو عریاں کر رہی ہیں۔ مجھ پہ ایک اور الزام بھی لگایا جا رہا ہے کہ میں کیوں "کشمیر کی آئین ساز اسمبلی" کے الحاق کے فیصلے کو آخری فیصلہ تصور نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں صداقت اور سچائی کو کبھی بھی نظروں سے اوجھل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خود بھارتی حکومت نے بھی اس آئین ساز اسمبلی کے فیصلہ کو آخری تسلیم نہیں کیا اور یہاں پر میں آپ کی توجہ اس بیان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو مرحوم سر بی این راؤ نے سلامتی کونسل میں ۹ر مارچ ۱۹۵۱ء کو ہندوستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے دیا تھا۔

"میری حکومت کا مطمح نظر یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی اپنی خواہش کے مطابق جو مرضی آئے کرے۔ اس فیصلہ کا کوئی احترام نہیں کیا جائے گا"

اور پھر دوبارہ ۲۹ر مارچ ۱۹۵۱ء کو کہا:-

"کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کو اس مسئلہ پر اپنے نظریات بیان کرنے سے روکا نہیں جا سکتا، لیکن اُس کی اِس رائے کی پابند نہ تو میری حکومت ہوگی اور نہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کی حیثیت پر کچھ فرق پڑے گا"

اس کے بعد سلامتی کونسل نے ایک ریزولیشن ۳۰ر مارچ ۱۹۵۱ء کو منظور کیا۔ جو حسب ذیل ہے:-

"اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن کے ۱۳ر اگست ۱۹۴۹ء کے ریزولیشن کو مدِنظر

رکھتے ہوئے حکومتِ بھارت اور پاکستان نے پھر یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ایک جمہوری طریق اور غیر جانب دار استصوابِ رائے عامہ سے کرایا جائے، جس کی نگرانی اور دیکھ بھال اقوامِ متحدہ کرائے۔

اس بات کو بھی مدِ نظر رکھا گیا ہے کہ ۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء کو آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے ایک ریزولیشن میں یہ سفارش کی تھی کہ ایک آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے، جہاں ریاست کے الحاق کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔"

ذمہ دار نمائندوں کی تقریروں سے یہ ظاہر ہوا کہ جس علاقہ میں آئین ساز اسمبلی ہوگی، اس کو صرف اس حصے کی اسمبلی تصور کیا جائے گا، نہ کہ تمام ریاست کی۔ دونوں حکومتوں اور ذمہ دار نمائندوں کی یاددہانی کے لیے پھر کہا جاتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کا آخری فیصلہ صرف عوام ہی کریں گے جس کے لیے غیر جانب دار رائے شماری اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں کرائی جائے گی۔ جیسا کہ سلامتی کونسل کے ۲۱ر اپریل سنہ ۱۹۴۸ء، ۳ر جون سنہ ۱۹۴۸ء، ۱۴ر مارچ سنہ ۱۹۵۰ء کے ریزولیشنوں میں ہے، اور اس سے پیشتر کشمیر کمیشن برائے پاک و ہند کے ۱۳ر اگست سنہ ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری سنہ ۱۹۴۹ء کے فیصلوں میں مذکور ہے۔ آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل کی آئین ساز اسمبلی کے لیے سفارش اور اس اسمبلی کا کوئی اقدام جو وہ ریاست کے بارے میں اختیار کرے، صرف ایک حصے کا تصور ہوگا اور اس کو تمام ریاست کے نہیں مانا جائے گا اور اس سے ان مندرجہ بالا اصولوں کی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اور اسی لیے بھارتی پارلیمنٹ میں آپ نے (نہرو) ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا :-

"کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کا فیصلہ الحاق کے بارے میں یک طرفہ ہے اور یہ مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتا"

"اسمبلی کے فیصلے ان تاریخی واقعات کی بنا پر جو وقوع پذیر ہو چکے ہیں الگ نہیں دیکھے جا سکتے۔ سوال ان فیصلوں کا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے محفوظ رکھنے کی کیا وجوہات تھیں۔ اور اسمبلی کی تشکیل اور الحاق کے آخری فیصلہ کے درمیان کیوں پانچ برس سے زیادہ عرصہ گزرا۔

"آئین ساز اسمبلی جس کو ۱۹۵۱ء میں حدِ متارکہ کے اس پار ہر دلعزیز اور نمائندہ حیثیت حاصل تھی، ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کے بعد کے واقعات سے اپنی نمائندہ حیثیت ختم کر چکی ہے اور عوام کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔ اس جماعت کے صفِ اوّل کے تمام لیڈر جیلوں میں ہیں، یا اُن کو اسمبلی کی کاروائی کے دوران باہر نکال دیا گیا ہے اور جو جیل میں نہیں تھے، اُن کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ ان سے غیر انسانی سلوک برتا گیا۔ اُن کے راستوں میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دئیے گئے۔ قدرتی طور پر عوام کا اعتماد اپنے نمائندوں سے اُٹھ گیا۔ اور اس کی وجہ سے اسمبلی کے ممبروں اور عوام کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اس قانون کی تکمیل پیشتر ہی اسمبلی کے لیڈر کو ایک گہری سازش کے ذریعہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔

اور جب عوام نے اس غیر قانونی اور غیر آئینی حرکت کے خلاف احتجاج کیا تو وحشت اور بربریت کا دور شروع کر دیا گیا جس کے نتیجے میں سینکڑوں مردوں عورتوں اور بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر ان کے خون کی ندیاں بہا دی گئیں - اور یہ عمل مہینوں جاری رہا - اس کے بعد پورے چار سال اسمبلی کے ممبروں کو اس کام کے لیے تیار کیا جانے لگا - اور جن ممبروں نے ایسا کرنے سے انکار کیا، انہیں قید میں ڈال دیا گیا اور آخر اپنی مرضی سے بھارتی ایجنٹوں نے اس قانون کو آخری شکل دی -

"قیدی ہونے کے باوجود، میں نے قومی بہبود کی رہنمائی

روزنِ دیوارِ زنداں

کی - اور وقتاً فوقتاً اُن تمام متعلقہ لوگوں کو ان خطرناک اثرات سے آگاہ کیا، جو نیشنل کانفرنس کی پھوٹ کی وجہ سے آئین ساز اسمبلی پر ظاہر ہُوئے تھے - ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کو میں نے ایک تار کے ذریعہ آئین ساز اسمبلی کے صدر کو کہا کہ مجھے اس بات کی اجازت دی جائے کہ میں اس کارروائی کو سُنوں، جب اسمبلی میں اس بات پر اعتماد کا ووٹ حاصل کیا جائے گا مگر ایسا نہ ہُوا -

اس کے بعد پھر جب آئین ساز اسمبلی اپنا کام ختم کر رہی تھی تو میں نے ۱۴ر اگست ۱۹۵۶ء کو صدر اسمبلی کو لکھا :-

"آپ کے ۹ر اگست ۱۹۵۳ء کے اقدام اور اسمبلی کے باہر آپ لوگوں کی سیاہ کاریاں اور حکومت اور اسمبلی کا طریقِ کار اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ آپ پر سے عوام کا اعتماد اُٹھ چکا ہے اور عوام کی سیاسی اور اقتصادی حالت سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہے - یہ

انتہائی ظلم ہے کہ ایک ایسی غیر نمائندہ اسمبلی عوام کے لیے قوانین مرتب کر رہی ہے۔ اس دھوکہ بازی سے زیادہ بُرا فعل اور کوئی بھی نہیں ہو سکتا، اس لیے میں محسوس کرتا ہوں اور یہ میرا فرض اوّلین کہ آپ کو اس اقدام پر ٹوکوں اور اس حرکت سے باز رکھوں۔"

۲۶ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو میرے رفیق کار مرزا محمد افضل بیگ نے آئین ساز اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے یوں متنبہ کیا تھا:

"اس ایوان کو الحاق کے بارے میں کسی قسم کا کوئی قانون بنانے کا حق نہیں ہے، کیونکہ یہ ایوان عوام کا احترام اور اعتماد کھو چکا ہے۔"

اس انتباہ کے بعد اُس کو اور اُس کے دیگر ساتھیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہ لیں۔ اس لیے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے بعد سے اس اسمبلی نے قانون کے نام سے جو کچھ کیا ہے، ان حالات کی روشنی میں اس کا کوئی مطلب نکل سکتا ہے۔ اس قانون کی بابت جس کا پس منظر یہ ہے۔ اس کے بنانے والے اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے جو مرضی میں آئے کہہ لیں، مگر عوام سے یہ توقع کرنی کہ وہ اس کا احترام کریں، عبث ہے۔ یا یہ سمجھ لینا کہ یہ سب کچھ عوام کی خواہشات کے مطابق ہے، ان لوگوں کی ناسمجھی اور حماقت ہے۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آئین ساز اسمبلی کے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کے فیصلہ کو عوام کی مکمل تائید و حمایت حاصل ہے، تو پھر انہیں استصواب رائے عامہ سے کیوں ڈر لگتا ہے۔ ان کو تو اس سے خوش ہونا چاہیئے۔ مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کی میری نامنظوری

کو کیوں (Breach of Pledge) 'عہد و قرار سے پھر جانے' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

مگر شیخ محمد عبداللہ کے مخالفین نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر اس حق گو انسان کو "غدار" کے نام سے پکارتے رہے۔ حالانکہ اس "غدار" کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ:-

"میری یہ ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ مجھے کوئی ایسا موقعہ میسّر آئے جس کی مدد سے میں بھارت اور پاکستان کے مابین مسئلہ کشمیر کے بارے میں کوئی صلح کرا دوں۔"

اور یہ اس لیے کہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا یہ عقیدہ ہے کہ:

ا۔ جب تک ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا آخری فیصلہ نہیں ہو جاتا، اُس وقت تک ریاست میں سیاسی انحطاط۔ اقتصادی بحران اور عوام کی معاشرتی تکلیفیں ختم نہیں ہو سکتیں۔

ب۔ بھارت اور پاکستان کے ناخوشگوار اور کشیدہ تعلقات نہ صرف ایشیا کے امن کے لیے خطرے کا باعث ہیں، بلکہ یہ ہر لحظہ ریاستی عوام کی تباہی و بربادی کے لیے بھی خدشہ ہیں اور قضیۂ کشمیر ہی ان دونوں ملکوں کے کشیدہ تعلقات کی سب سے بڑی اور اہم وجہ ہے۔

ج۔ ریاست کے مستقبل یا الحاق کا آخری فیصلہ صرف عوام ہی کر سکتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ انہیں ان کا حقِ خود ارادیت دیا جائے۔ اور کسی ایسے بین الاقوامی غیر جانب دار ادارہ کی نگرانی میں جسے کہ تمام عالمی رائے عامہ کا اعتماد حاصل ہو، استصوابِ رائے عامہ ہو۔

کیونکہ اس نقطے پر دونوں فریق پیشتر ازیں ہی متفق ہو چکے ہیں اور پھر اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ایسا طریقِ کار اختیار کیا جائے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔

متبادل تجاویز

مندرجہ بالا واقعات سے ان الزامات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے جو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے نکتہ چینوں اور مخالفین نے اُن پر لگائے تھے۔

اب دیکھنا یہ چاہیئے کہ ان لوگوں نے کیا کیا، جو شیخ صاحب کے خلاف زبانِ طعن دراز کرنے میں شروع سے پیش پیش رہے ہیں، لیکن اس سلسلے میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم پہلے شیرِ کشمیر کی متبادل تجاویز کو بھی دیکھ لیں جو انھوں نے وقتاً فوقتاً "مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے پیش کی ہیں۔ اس سے الحاق کی "سازش کی کہانی" بھی مکمل ہو جائے گی، اور شیرِ کشمیر کی سیاسی زندگی کے یہ پہلو بھی لوگوں کے سامنے آجائیں گے۔

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے چار متبادل تجاویز "ٹائمز" لنڈن کے نمائندہ خصوصی کو پیش کی تھیں:-

اوّل۔ ریاست جموں و کشمیر کے طول و عرض میں رائے شماری کے ذریعے ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کا فیصلہ

دوم۔ کشمیر کی مکمل آزادی

سوم۔ کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ نگرانی (Condoednium) میں دے دیا جائے اور کشمیر کے دفاعی اور خارجہ اُمور کو دونوں ملک مشترکہ طور

پر کنٹرول کریں۔

چہارم۔ ریاست کشمیر کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

(الف)۔ ہندو اکثریت کا علاقہ (جموّں) ہندوستان سے اور شمال مغربی علاقے بہ شمول گلگت و ہنزہ پاکستان سے ملا دئے جائیں۔

(ب)۔ وادیٔ کشمیر اور کشمیری بولی والے دوسرے علاقے آزاد رکھے جائیں۔

"ٹائمز کا بیان ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کی یہ تجویزیں ۱۹۵۳ء میں نیشنل کانفرنس نے منظور کر لی تھیں اور پنڈت نہرو کو اس سفارش کے ساتھ ارسال کی تھیں کہ وہ ان پر جس تجویز کو بھی چاہیں قبول کر لیں، مگر پنڈت نہرو نے ہند و پاک کے اس طویل جھگڑے کو ختم کرا دینے والے داعی شیر کشمیر محمد عبداللہ کو پھر آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا، جن سے اہنسا کے سب سے بڑے دیوتا مہاتما گاندھی انہیں چھڑا کر لائے تھے، اسی اُمید پر کہ وہ بھارت کا ساتھ دیں گے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ اپنے عوام کا ساتھ دیا۔ اور بھارت سرکار کو کہا :-

"ہم اُس وقت تک بھارت سے الحاق کس طرح کر سکتے ہیں، جب تک بھارت میں فرقہ پرستی کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ کشمیر پر بھارتی آئین کا اطلاق بچگانہ، غیر حقیقی اور دیوانہ پن کے مترادف ہے۔

شیخ عبداللہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا، وہ بھارت یا کسی دوسری طاقت کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں۔ اور کرشنا مینن کی لفاظی سے کشمیر کے الحاق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ کشمیر مینن کا نہیں، کشمیر نہرو کا نہیں، کشمیر عبداللہ کا نہیں، کشمیر چالیس لاکھ عوام کا ہے،

اور وہی اُس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں"

ان حقائق سے صاف طور سے واضح ہوتا ہے کہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ بھارت کی سازش الحاق میں شریک نہ تھے اور یہ بھی اس خفیہ سازش سے اُسی طرح بے خبر تھے، جس طرح مسلم لیگ، حکومتِ پاکستان اور پونچھ کے مجاہدین۔ اور اس سازش کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو کو یہ کہنے کا موقع نہیں رہا کہ انھوں نے بڑے بڑے کانگرسیوں کی طرح کوئی سازش نہیں کی۔ اور اس طرح اُن کی سازش کرنے کی خلش بھی دور ہو گئی اور وہ بڑے کانگرسی[1] بھی بن گئے ---!!!

آیندہ صفحات میں آزاد کشمیر، مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کا تقابل اور مسئلہ کشمیر کی بین الاقوامی حیثیت زیرِ بحث آئیں گے ---!

---

[1] "مجھے یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ بڑے بڑے کانگرسی بھی کس طرح سازشیں کر سکتے ہیں"
("میری کہانی" از جواہر لعل نہرو صفحہ ۱۸۶)

مُسلم کانفرنس ۔ نیشنل کانفرنس ۔ آزاد کشمیر

مُسلم کانفرنس۔ نیشنل کانفرنس۔ آزاد کشمیر"

"تحریک آزادئ کشمیر" کی نشو و ارتقا میں دو بڑے سیاسی مکتبۂ فکر و عمل ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ایک مُسلم کانفرنس

دوسرا نیشنل کانفرنس

ان دونوں نے اپنے اپنے وسائل و ذرائع کے مطابق آزادئ وطن کے لیے کوششیں کی ہیں۔ اور دونوں جماعتوں کی قربانیوں اور مساعئ جمیلہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہ حیثیت مجموعی نیشنل کانفرنس کا سیاسی کردار مُسلم کانفرنس کے سیاسی طریق کار سے عظیم تر اور گراں مایہ رہا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس بلند مقام کو حاصل کرنے کی بجائے اُسے ختم کرنے کے لیے مسلم کانفرنس نے اپنا زیادہ وقت صرف کیا تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اسی کے باعث واقعہ یہ ہے تحریک آزادئ کشمیر کو بے حد نقصان پہنچا، اگر مسلم کانفرنس کے قائدین دوسروں کی عظمت کو حاصل

کرنے کے "حاسدانہ جنون" کا شکار ہو کر اپنی اولین اور حقیقی راہ کو نہ چھوڑتے تو آج وطن و قوم کی حالت اتنی دگرگوں اور منتشر نہ ہوتی۔

یہاں پر ہمیں نے نیشنل کانفرنس کو مسلم کانفرنس پر ترجیح دی ہے، یہ جانتے ہوئے کہ خود نیشنل کانفرنس نے مسلم کانفرنس کی آغوش میں جنم لیا تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ نیشنل کانفرنس کے سربراہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی جدوجہد اور عوامی طاقت کو دیکھنے کے بعد اُن کو اور اُن کی سیاسی جماعت کو ریاست جموں و کشمیر کی سب سے بڑی عوامی جماعت قرار دیے بغیر چارہ نہیں اور پھر چودھری غلام عباس کے اس اعتراف کی موجودگی میں تو کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں ——

"کشمیری مسلمانوں کے لیے دنیا کے بڑے بڑے تاجداروں اور فرمانرواؤں کا حکم مذہبی رہنماؤں کے حکم کے سامنے ہمیشہ ہیچ اور بے اثر رہا ہے، لیکن جب کشمیر میں سیاسی بیداری کی وجہ سے مذہب کی بجائے سیاست نے جگہ لی تو یہ اقتدار سیاسی کارکنوں کی طرف منتقل ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں شیخ عبداللہ کی سیاسی حیثیت وادیٔ کشمیر کے دیگر کارکنوں سے زیادہ ممتاز ہو گئی"...... "بعد میں سیاسی جدوجہد اور گرفتاری کی وجہ سے شیخ عبداللہ کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی اور اسی اکابر پرستی کے جذبہ کے تحت کشمیری عوام اس کے اندھا دھند پیرو ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ نیشنل ازم کو اپنانے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی عوام شیخ عبداللہ کے ہم خیال رہے"

کشمکش از غلام عباس $\frac{۱۹۸}{۱۹۹}$

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام نے نیشنل ازم کو کیوں اپنایا اور وہ کیا سیاسی

نفسیاتی اور معاشرتی حالات تھے جن کو مدِنظر رکھتے ہوئے تحریک کو "حقیقی رنگ" دیا گیا ——— اگر اس سلسلہ میں پھر چودھری غلام عباس ہی سے رجوع کریں تو وہ زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ موصوف مسلم کانفرنس کے ۱۰ رجون ۱۹۳۹ء کے اس سپیشل اجلاس[1] میں موجود تھے جس میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کا ریزولیشن مولوی محمد سعید

---

[1] یہ اجلاس ۱۰ جون ۱۹۳۹ء کو شاہی مسجد سری نگر میں خواجہ غلام محمد صادق کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تمام ریاست جموں و کشمیر کے کونے کونے سے نمایندگان موجود تھے۔ ۸۰۰ ڈیلیگیٹ اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں عوام موجود تھے ——

ریزولیشن: آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا اجلاس خاص اس کانفرنس کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۸ جون ۱۹۳۸ء کی قرارداد نمبر ۵ تصدیق و توثیق کردہ اجلاس مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۷ راپریل کو منظور کرتا ہے۔ اور قرار دیتا ہے کہ اس کانفرنس کا نام آیندہ کے لیے نیشنل کانفرنس ہوگا اور ریاست جموں و کشمیر کا ہر بالغ انسان مرد ہو یا عورت بلاتمیز مذہب و ملت رنگ و نسل اس کانفرنس کا ممبر بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ شخصی آزادی کے حصول اور ذمہ دار حکومت کے قیام کو اپنا نصب العین سمجھنے کا اعلان و اقرار تحریری طور پر کرے۔

نیز یہ اجلاس قرار دیتا ہے۔ کہ آیندہ سالانہ اجلاس تک موجودہ مجلسِ عاملہ و مجلسِ شوریٰ کے ارکان و عہدہ دار اجلاس خاص کے مندوبین اور ماتحت مجالس کے وہ ارکان جدید دستورِ اساسی کی شرائط کے اقتضاء کو پورا کریں گے۔ کشمیر نیشنل کانفرنس کے رکن متصور ہوں گے اور اسی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیں گے۔ اس تاریخی تجویز کو بکثرت رائے تسلیم کیا گیا ——"

مسعودی نے پیش کیا اور چودھری غلام عباس اور مسٹر اے۔ آر ساغر نے اس کی تائید اور مزید تائید کی۔

اس اجلاس میں چودھری غلام عباس نے حسب ذیل تقریر کی:-

"۱۹۳۱ء میں ریاست کی سیاست نو پیدا شدہ اور عالم طفولیت میں تھی۔ اس وقت نوزائیدہ سیاسیات کے لیے جو لباس تجویز کیا گیا، آج جبکہ سیاست جوان ہو چکی ہے، وہ لباس تنگ ہو چکا ہے اور ضرورت ہے کہ سیاسیات کے موجودہ جسم کے مطابق لباس کا انتظام کیا جائے۔ اس کانفرنس میں وسعت پیدا کر کے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی شامل کرنا اسی مقصد کا تابع ہے۔ زمانہ بدلتا ہے۔ حالات بھی ساتھ ساتھ بدلتے ہیں۔ بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ جدید پروگرام تجویز کرنا پڑتا ہے۔ جب ہم مطالبات ایسے کر رہے ہیں جو ریاست کے سب لوگوں کو ایک صف میں کھڑا کرنا بھی ضروری ہے اس لیے میں اس ریزولیشن کی تائید کرتا ہوں آپ حضرات کو "قائد اعظم" شیر کشمیر کی خدمات اور کارناموں کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور دشمنوں کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اسلام کو خطرے میں کہنے والے گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اقلیات کا اتحاد حاصل ہونے سے نہ صرف ہم نصب العین کے قریب چلے جائیں گے بلکہ ہماری مشکلات بھی حل ہو جائیں گی"۔

(انصاف ۱۳ ستمبر ۱۹۶۲ء)

چودھری غلام عباس کی تقریر کے بعد مسٹر اے۔ آر ساغر نے بھی تجویز کی تائید

کی اور کہا:۔

"میرا خیال ہے کہ تجویز کو صرف مذہبی لحاظ سے نہیں دیکھنا چاہیئے جس طرح ہم اسکولوں، کالجوں، کھیتوں اور بازاروں میں کام انجام دیتے وقت نہیں دیکھتے کہ ہمارے دوش بدوش صرف مسلمان ہیں۔ یا اور کوئی۔ اس طرح ہمیں سیاسیات میں حصّہ لیتے وقت بھی ایسا ہی کرنا چاہیے"

انتشار کی وجہ نیشنل کانفرنس کی ترتیب و تشکیل کے بعد شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے ایک عزم اور جوش کے ساتھ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو جاری کر دیا۔ اور مسلمانان جموّں وکشمیر کے سیاسی لیڈروں میں جو اختلافات تھے ان کو ختم کر کے نہ صرف ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا بلکہ ریاستی ہندوؤں کو بھی اپنا شریکِ سفر بنایا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت سخت سیخ پا ہوئی اور اس نے درونِ پردہ ایسی سازشیں شروع کر دیں جن کا مقصد اس قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ آخر حکومت اپنی سازشوں میں کامیاب ہوگئی اور اتحادِ قومی کا جو مظاہرہ سری نگر میں ہوا تھا، اس سے ایک گروہ علیحدہ ہوگیا۔ گو اس علیحدگی کو چودھری غلام عباس شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی "کانگرس نوازی"[1] گردانتے ہیں۔

---

[1] چودھری غلام عباس بار بار کہتے ہیں کہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کانگرس نواز ہو گئے تھے اس لیے میں نے ان سے علیحدگی اختیار کی۔ یہ بات تاریخی شواہد کی روشنی میں درست نہیں ہے کیونکہ مسلم لیگ کی تاریخ میں یہ بات نہیں ملتی کہ چودھری غلام عباس نے اس عرصہ میں آل انڈیا مسلم لیگ سے کوئی رابطہ قائم کیا ہو۔ یہ بات انھوں نے قیام پاکستان کے بعد تراشی ہے کیونکہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۲۴۲)

اور بقول اُن کے جس سے کہ تنگ آکر انھوں نے مسلم کانفرنس کی "نشاۃ الثانیہ" کا اقدام واجب جانا، مگر ستم یہ ہے کہ انھوں نے جماعت کی "تنظیم جدید" میں اپنے ساتھ ان لیڈروں کو بھی ملا لیا جو اندرونِ ریاست تحریک پاکستان کے بارے میں اچھے نظریات نہیں رکھتے تھے اور خود اس زمانہ میں چودھری غلام عباس نے ایک بیان مطبوعہ روزنامہ "ٹربیون" لاہور میں قراردادِ پاکستان کی مخالفت[1] کی اور اس بات کی تصدیق حضرت قائدِ اعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب کے ایچ خورشید کے ایک مضمون بعنوان "کشمیر ابھی تک پاکستان میں کیوں نہیں ہے؟" سے بھی ہوتی ہے جو موصوف نے اپنے اخبار "گارڈین ویکلی" کی ۲۵ جون ۱۹۵ء کی اشاعت میں تحریر کیا تھا۔ مسٹر کے۔ ایچ۔ خورشید رقمطراز ہیں کہ چودھری غلام عباس کے اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۱) جس دور میں کشمیر نیشنل کانفرنس معرضِ وجود میں آئی۔ اُس وقت خود مسلم لیگ کی حالت بقول رئیس احمد جعفری مصنّف "تاریخ مسلم لیگ" اور "دید و شنید" یہ تھی۔

" اس وقت تک مسلم لیگ مسلم ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت نہ تھی وہ اُبھر رہی تھی، لیکن اب تک اس میں اتنی قوت نہیں آئی تھی کہ وہ عوام پر حکومت کر سکے اور اپنے ممبروں کو قابو میں رکھ سکے" "دید و شنید" (صفحہ ۲۱۲)

اس لیے مسلم لیگ کا ریاستی امور میں دخل دینا قبل از وقت تھا۔ اگرچہ چودھری غلام عباس کانگرس سے اتنے ہی دل برداشتہ تھے تو انھوں نے پاکستان کے لاہور ریزولیشن کی مخالفت کیوں کی۔ حالانکہ پونچھ کے ایک راہنما مولوی غلام حیدر جنڈالوی نے اس جلسے میں حمایتی تقریر کی تھی۔

[1] ہفت روزہ انصاف۔ راولپنڈی ۲۵ جنوری ۱۹۶۲ء

بیان کو کانگریسی اخبار ٹریبون لاہور نے "پاکستان کے تابوت میں آخری کیل" قرار دیا۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ چودھری غلام عباس کا یہ کہنا کہ انھوں نے شیخ محمد عبداللہ کی رفاقت کو محض اس بنا پر چھوڑا کہ انھوں نے کانگریس کی ہندو نواز حکمتِ عملی کو اپنا لیا تھا، بالکل غلط ہے کیونکہ انھوں نے خود اس وقت کی اسلامیانِ ہند کی سیاسیات کی مخالفت کی اور اپنے سیاسی سفر میں اس سیاسی لیڈر کو شریک کیا جس نے پاکستان کی قرارداد کو بہتر نہیں جانا تھا۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ آج انھیں مسٹر اے۔ آر ساغر نے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد چودھری غلام عباس کو اپنا "سیاسی پیر" تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - خیر آمدم برسرِ مطلب اس سے یہ ظاہر ہوا کہ چودھری غلام عباس کے تحت الشعور میں جو چیز تمام ریاست کا لیڈر بننے کے لیے تڑپ رہی تھی، پھر سامنے آگئی۔ بدقسمتی سے اس انتشار کے آثار جو بعد میں رونما ہوا تحریک کے ابتدائی مراحل ہی میں نظر آ رہے تھے۔ انہی کو نیست و نابود کرنے کے لیے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے علامہ اقبال رحمۃ تک سے بھی رجوع کیا اور انھیں یہ دعوت دی کہ وہ خود کشمیر آکر اس انتشار کو ختم کرائیں۔

چنانچہ کشمیر مسلم کانفرنس میں کشمیری لیڈروں کے باہمی اختلافات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ کھلم کھلا ایک دوسرے پر تنقید کرنے لگے۔ اور نہ صرف حکومت سے ساز باز میں شریک ہوئے بلکہ ایک دوسرے پر "صوبائی سیاست" کی روشنی میں فوقیت حاصل کرنے میں کوشاں ہو گئے۔ اس بات کا یہ اثر ہوا کہ تحریک حریت کشمیر کی اندرونی صفوں میں انتشار نے جنم بھی لے لیا اور یہ لیڈر اپنے اپنے صوبوں اور ضلعوں

میں اپنی اپنی لیڈری کا چکر چلانے لگے۔ بعد کے واقعات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اگر چودھری غلام عباس ریاستی عوام کی اس تحریک سے دیانت دار ہوتے تو یہ جنگِ آزادی کبھی بھی اس طرح حسرت و یاس کی صورت میں ختم نہ ہوتی۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

اپنی کتاب "کشمکش" میں چودھری غلام عباس نے تحریر کیا ہے کہ انھوں نے شیخ محمد عبداللہ کو کہا۔ کہ میرا ہندوستانی سیاست سے کوئی تعلّق نہیں۔ اور میں کانگرسی پالٹیکس اور اس کے نیشنل ازم کو قوم اور ملک کے لیے ایک لعنت سمجھتا ہوں"۔۔۔۔ اس سے اگر پنڈت جی سے بھی بڑا کوئی لیڈر ہو تو مجھے ملاقات کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جو بین الاقوامی شہرت کے طالب ہوں۔ اس پر شیخ محمد عبداللہ کے مزاج کا پارہ بہت چڑھ گیا۔ اُس دن اُن کی گفتار اس قدر واہی تباہی تھی کہ مجھے ان کی حالت پر ترس آتا۔ کیونکہ ہمارے دو اور دوست بھی موجود

تھے جو اُن کے لیے نیم اجنبی تھے۔ بس اس واقعہ کے بعد میری ایک ہنگامی ملاقات ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ جب حضرت قائدِ اعظم سری نگر تشریف لائے۔ اور دوسری ۱۹۴۸ء میں سنٹرل جیل جموں میں جبکہ شیخ صاحب چیف ایڈمنسٹریٹر بن چکے تھے۔"

(کشمکش صفحہ ۲۱۹)

مندرجہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) چودھری غلام عباس کا "ہندوستانی سیاست" سے کوئی تعلق نہ تھا۔

(۲) نیشنل اِزم ملک کے لیے لعنت ہے۔

(۳) کسی بڑے لیڈر سے ملنے کا خواہش مند نہیں۔ یہ ان کا کام ہے جو بین الاقوامی شہرت کے طالب ہوں۔

(۴) اُن کی شیخ عبداللہ سے دو ہنگامی و مختصر ملاقاتیں ہوئیں (تفصیلات کا ذکر نہیں کیا)

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بیان کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے کہ چودھری غلام عباس نے قرارداد لاہور کی مخالفت کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاست سے بے تعلق نہ تھے۔ چودھری غلام عباس کا یہ کہنا کہ لیڈروں سے وہی ملتے ہیں جو بین الاقوامی شہرت کے طالب ہوں، دراصل اُن کی تحت الشعور میں چھپی ہوئی ایک خواہش کا اظہار ہے جس کی تسکین شاید شیخ عبداللہ کے ہم سفر ہونے سے نہ ہو سکتی۔ کیونکہ اگر وہ اتنے ہی "شانِ استغنا" کے پیکر ہوتے تو کبھی بھی مسٹر گورمانی اور گورنر پنجاب کی وساطت سے مرزا بشیر الدین محمود کو یہ نہ کہلواتے کہ وہ ایک بیان دیں جس میں یہ کہا جائے کہ چودھری غلام عباس کشمیر کے سب سے بڑے لیڈر ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے اس وقت ایسا بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

کیونکہ وہ اصل حقائق سے ناآشنا نہیں تھے۔ (یہاں یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ راقم الحروف کو آزاد کشمیر کے ایک سابق صدر کے پولٹیکل سیکرٹری نے اپنے صدر کی برطرفی کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی کہ اُس صدر آزاد کشمیر نے سیالکوٹ کے جلسہ عام میں چودھری غلام عباس کو "قائدِ ملت" کے نام سے نہ تو یاد کیا اور نہ ان کی تعریف کی تھی اور یہی بات باعثِ عتاب بنی) آخر میں چودھری غلام عباس نے جیل میں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جیف ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس ملاقات میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ ضبطِ تحریر میں نہیں لائے ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے لارڈ برڈ ووڈ کا جنھوں نے اپنی مشہور کتاب "دو قومیں اور کشمیر" میں اس ملاقات کو یوں ریکارڈ کیا ہے اور اس واقعہ کو مشہور مصنّف جوزف کاربل نے بھی اپنی کتاب "کشمیر میں خطرہ" کے صفحہ ۲۰۳ پر درج کیا ہے :-

"ستمبر ۱۹۴۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مجھے بتایا کہ اس نے جیل میں چودھری غلام عباس سے کئی راتوں تک طویل ملاقاتیں کی ہیں جن میں یہ طے پایا کہ آزادی کی جدوجہد کو کس طرح پھر مصالحت کے ذریعہ جاری کیا جاسکتا ہے۔ اور یہی کہانی چودھری غلام عباس نے مجھے بھی سنائی۔ ان دونوں لیڈروں نے یہ گفتگو بڑے یاس بھرے لہجہ میں کی۔ انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ۱۹۳۹ء میں ہماری جدائی ہی ان مشکلات کا آغاز بنی تھی۔

مسلم کانفرنس کا مشن

غرضیکہ چودھری غلام عباس نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے مدِمقابل اپنی جماعت

مسلم کانفرنس قائم کرلی اور بقول اُن کے اُن کو صوبہ جموں میں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے خلاف "اپنے ہاتھوں سے باندھی ہوئی سیاسی گانٹھوں کو دانتوں سے کھولنا پڑا۔ خاص کر تحصیل راجوری اور کسی حد تک میرپور میں مسلمانوں کے ایک حصّہ کو شیخ عبداللہ سے منحرف کرانے میں کافی دِقّت کا سامنا ہوا۔"

(کشمکش صفحہ ۲۲۲)

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چودھری غلام عباس اور اُن کی جماعت کے سامنے اب واحد مقصد شیخ محمد عبداللہ کی سیاست کو زائل کرنا تھا اور اس غرض کے لیے انھوں نے وادیٔ کشمیر میں میرواعظ یوسف شاہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ کیونکہ بقول اُن کے

"میرواعظ کشمیر کے خاندان کو احساس ہو چلا تھا کہ عبداللہ اب ہماری خاندانی پوزیشن کو ملیا میٹ کر دے گا۔ اور میرواعظوں کا قدیمی وقار اور اعتبار ختم ہو جائے گا"

(کشمکش صفحہ ۱۵۰)

اور میرواعظ کشمیر کے اس کمزور پہلو کو جانتے ہوئے انھوں نے انھیں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے مدِّمقابل وادیٔ کشمیر میں کھڑا کر دیا۔ اب مسلم کانفرنس نے اندرون اور بیرون ریاست شیخ محمد عبداللہ کے خلاف تحریک شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیرِ کشمیر

ؔ لطف یہ ہے کہ بعد میں انھیں میرواعظ صاحب نے چودھری غلام عباس کے ڈائرکٹ ایکشن میں نہ تو حصّہ لیا، اور نہ ہی حکومت کی مخالفت کی بلکہ پاکستان آکر ان کے خلاف متوازی جماعت بنائی اور پھر ان کے صدارتی امیدوار سردار قیوم خاں کی مخالفت کی۔

شیخ محمد عبداللہ طرح طرح کی بدگمانیوں کے شدید ردِّ عمل کے شکار ہو کر بالخصوص پنجاب کے مسلمان سیاسیین سے دور چلے گئے۔ اور اُن کو اپنی تحریک کے لیے کانگرس کے مسلمان لیڈروں سے معاونت حاصل کرنی پڑی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اور خان عبدالغفار خاں شروع ہی سے شیخ محمد عبداللہ کے طریقہ کار کو سراہتے رہے اور اُن کی طرف سے شیخ صاحب کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی۔ مسٹر آصف علی خود "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کے مقدمہ میں سپری نگر آئے اور اس مقدمہ کی پیروی کی۔ الغرض اخلاقاً اور اصولاً شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ان لوگوں کے مرہونِ منت ہو گئے۔ برعکس اس کے مسلم کانفرنس نے اُن کے ہر اقدام کی مخالفت کی، اور اس سلسلے میں وہ کام کیا جو ہندو ڈوگرہ حکومت بھی نہ کر سکی۔ مثال کے طور پر "کشمیر چھوڑ دو" کی زد براہِ راست مہاراجہ کی حکومت پر پڑتی تھی اور برِّ صغیر کے تمام آزادی پسند اخبارات اور لیڈر شیر کشمیر کے اس اقدام کو سراہ رہے تھے لیکن ہمارے قائدین تھے جو ہر جگہ یہ کہہ رہے تھے کہ یہ تحریک کمیونسٹوں کی ہے اور یہی لوگ کسی حد تک حضرت قائدِ اعظم رح کو بھی بدظن کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، جیسا کہ مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر "نوائے وقت" کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے جس کا ذکر چودھری غلام عباس نے کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل خود چودھری غلام عباس کے اپنے مخصوص انداز میں ملاحظہ ہو:۔

"چند دن بعد میں قائدِ اعظم رح سے ملنے دہلی چلا گیا۔ وہ پہلے ہی اس تحریک کے خلاف تھے۔ اور کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے فرمایا کہ میں نے تمھارے ریزولیشن پڑھ لیے ہیں۔ بالکل مناسب اور بروقت ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سیکرٹری مسٹر خورشید کے ذریعہ اس تحریک

کے خلاف ایک بیان بھی لکھوایا۔ بعد میں مسٹر ساغر کے ہمراہ لاہور آیا، اور سب سے پہلے حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب سے ملاقات کی، جن کی سیاسیاتِ کشمیر سے گہری دلچسپی آغازِ تحریک ہی سے مسلّمہ تھی مولانا اختر علی خان صاحب بھی موجود تھے۔ ہم نے شیخ عبداللہ کی تحریک کے نشیب و فراز سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اختر صاحب کشمیر کے معاملہ میں بالخصوص جذباتی رہے ہیں پہلے تو وہ پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتے تھے۔ لیکن کافی لے دے کے بعد وہ قدرے مطمئن ہو گئے جناب میکش سے بھی یہی ماجرا ہوا۔ آخر میں ہم برادرم حمید نظامی کے پاس پہنچے لیکن میرے تعجب اور افسوس کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے اُن کو اس معاملہ میں دوسروں سے بھی زیادہ سخت پایا۔ ٹھنڈے دل کا مالک ہونے کے علاوہ وہ میرے گہرے دوست بھی تھے۔ دورانِ بحث میں جب میں نے قائدِ اعظمؒ کے حالیہ بیان کا حوالہ دیا تو حمید نظامی صاحب نے فوراً مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ قائدِ اعظمؒ نے یہ بیان تمہارے ایما پر دیا ہے۔ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔" (کشمکش۔ صفحہ ۳۱۹)

اب قارئین کرام خود اندازہ لگائیں کہ کشمیریوں پر خود کشمیری لیڈروں نے کس طرح تیرِ ستم چلائے ہیں۔ اور اُن کی جدوجہد آزادی کی راہ میں کیا کیا روڑے اٹکاتے رہے ہیں۔ ایک طرف ان لیڈروں کو (غلام عباس گروپ) یہ اعتراف ہے کہ "کشمیر چھوڑ دو تحریک" اس طرح منظم تھی ——

—— "تحریک کا "انڈر گراؤنڈ" کام اتنا باقاعدہ تھا کہ پنجاب کے تمام مسلم اخبارات کی کاروائی سری نگر میں روزانہ منظر عام پر اشتہاروں اور ٹریکٹوں کی صورت آجاتی تھی —— اور اس صورتِ حال نے ہمیں تشویش میں ڈال دیا۔ (کشمکش صفحہ ۳۱۰)

—— اور دوسری طرف ان لیڈروں کی یہ سازشیں —— شاید اِس "تشویش" کو ختم کرنے کے لیے چودھری غلام عباس نے باقاعدہ طور پر تحریک آزادی وطن کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی جسے دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے "روزنامہ زمیندار" نے اپنے متعدد اقتتاحیوں میں مسلم کانفرنس کو رجعت پسندی کا سرٹیفکیٹ دیا۔ اور "نوائے وقت"، "انقلاب" اور "احسان" نے کافی کچھ لکھا —— اور واقعہ یہ ہے کہ ان مسلم اخبارات کا ایسا لکھنا بالکل درست تھا۔

تحریک "کشمیر چھوڑ دو" حکومت کی سنگینوں اور اپنوں کی سازشوں کی وجہ سے بار آور نہ ہوسکی اور ریاست جمّوں وکشمیر کی وہ تحریک جس نے برطانوی ہند تک کو متاثر کر دیا تھا، چودھری غلام عباس کے "عدم تعاون" کی وجہ سے ناکام رہی اور خود چودھری غلام عباس بھی اُسی دور میں اُس سیلاب کی رو میں ایسے بہے کہ نہ اُن کے پاس جماعت رہی، نہ قوم، نہ وطن —— لیکن اس کے برعکس شیرِ کشمیر وطن ہی رہے اپنی قوم کی نگہبانی اور رہبری کے لیے اب وہ محض فرد واحد ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ ہیں۔ جن سے کشمیر کا مستقبل وابستہ ہے اور ساری دنیا کی نظریں اُدھر لگی ہوئی ہیں۔

راہِ فرار جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس

نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کے دوران اپنی تمامتر سرگرمیاں نیشنل کانفرنس کو ختم کرنے پر وقف کر دی تھیں۔ اور جب یہ حقیقت عوام پر منکشف ہوئی تو ان لوگوں کے سامنے کوئی چارہ نہیں تھا کہ یہ بھی کسی صورت سے گرفتار ہو جائیں، مگر انھوں نے مسلم لیگ ہائی کمان اور مسٹر حمید نظامی ایڈیٹر "نوائے وقت" کے مشورہ کے خلاف جیل جانا قبول کر لیا اور اس طرح انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی سعی کی مگر

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ایک بھی تیر نشانہ پر نہ بیٹھا۔ نہ حکومت نے ان کو کوئی اہمیت دی اور نہ عوام نے ہی۔ بلکہ سری نگر اور جموں میں تو عوام کی حالت سر ٹامس مور کی "یوٹوپیا" کے لوگوں کی سی تھی جو ایک غیر ملکی وفد کو دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگے تھے۔

"ایک بار یوٹوپیا میں ایک ملک کا سفارتی وفد آیا۔ وفد کے ارکان اپنے ملک کی دولت و وقار کا مظاہرہ کرنے کے لیے زرتار لباس پہنے۔ اور ان پر سونے چاندی کے منقش تار اور ہیرے جواہرات میں جڑی ہوئی ٹوپیاں لگائیں۔ جب یوٹوپیا کے دارالحکومت کی سڑکوں پر یہ وفد گزرا تو لوگوں نے وفد کے ممبروں کو ممبروں کا غلام اور نوکر چاکر جو سادہ لباس پہنے تھے آقا سمجھا، اور ایک بچہ چلا اُٹھا کہ

"ماما دیکھو۔ یہ بوڑھا اب بھی ہیرے جواہر کی ٹوپی لگاتا ہے۔"

ماں نے بچے کو ڈانٹ کر کہا۔

"ہش چپ رہو یہ شخص کسی معزز آدمی کا مسخرا نوکر ہوگا۔"

غرضیکہ عوام نے اس تحریک کا یہی ڈراپ سین دیکھا اور خود اس کے وارث

مختلف حصوں میں بٹ گئے۔

اوّل - چودھری حمید اللہ خان گروپ۔

دوم - میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ کا گروپ۔

سوم - سردار محمد ابراہیم خاں کا گروپ

اوّل گروپ نے جو نعرہ بلند کیا، وہ حکومتِ کشمیر کی "خود مختار پالیسی" کی بازگشت کے گرد گھوما۔

دوئم گروپ کا حال بقول چودھری غلام عباس یہ ہوا کہ "میر واعظ کے بھائی اور سیکرٹری مسلم کانفرنس سری نگر کو حکومت نے بلوا کر کچھ کہا سنا جس کی وجہ سے میر واعظ سول نافرمانی کے فیصلے سے منہ موڑ گئے ہیں۔

سوئم گروپ پونچھ میں برسرِ پیکار تھا اور اس کی سیاسی سرگرمیاں مہاراجہ کشمیر کے خلاف تھیں۔

اوپر کے بیانات سے مندرجہ ذیل حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں:۔

اوّل : ریاست میں دو جماعتیں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس تھیں۔

دوئم : پہلی جماعت نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اس کے کئی لیڈر جیل میں اور کئی ریاست بدر ہو گئے اور جماعت کی عنان درجہ دوئم کے لیڈروں کے ہاتھ میں آگئی، جن کے سامنے اپنے لیڈروں کو رہائی دلانا اور مطالبات کو تسلیم کرانا تھا۔

سوئم : مسلم کانفرنس نے اس تحریک کی مخالفت کی اور اس کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔

چہارم: مسلم کانفرنس کے اس اقدام کو پنجاب کے مسلم پریس اور کشمیری عوام نے ناپسند کیا بلکہ نجی محفلوں میں چودھری غلام عباس کی مخالفت بھی کی گئی۔

پنجم: مسلم کانفرنسی لیڈر بعد میں خواہ مخواہ، زود پشیماں ہو کر جیل چلے گئے۔ حالانکہ اُس وقت جیل جانا بالکل بے کار تھا۔

ششم: یہ لیڈر خود ہی باہم دست و گریباں ہوئے اور ان میں آپس میں چلنے لگی۔ اب اس پس منظر میں مسلم کانفرنس کے سیاسی کردار کا حاصل یہ نکلا۔

واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کی خرابی کی اصل وجہ مسلم کانفرنس کی غیر واضح پالیسی اور اس کا سیاسی طریق کار ہے، اگر یہ جماعت خلوص، نیک نیتی اور صحیح طرح سے کام کرتی تو جموں کے مسلمان اس بیدردی اور سنگدلی سے تہ تیغ نہ کیے جاتے۔ وہ یوں تباہ و برباد نہ ہوتے اور اُن سے اُن کی پاکستان دوستی اور اسلام سے والہانہ محبّت و عقیدت کا اس طرح انتقام نہ لیا جاتا مگر مسلم کانفرنسی قیادت نے "حاسدانہ جنون" کی رو میں بہ کر پیش آمدہ مسائل کو نہ دیکھا (بلکہ ستم یہ ہے کہ اب بھی یہ قیادت حقائق سے روگردانی کر رہی ہے) جس کے نتیجے میں مسلمانانِ جموں اب در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اب ذیل میں مسلم کانفرنس کے انتشار کے اسباب و عمل کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قصّہ قائم مقام صدارت کا

چودھری غلام عباس، مسٹر اے آر ساغر، آغا شوکت علی، مولوی نور دین، مسٹر اسمٰعیل

ساغر اور مسٹر راہبر آف کشمیر کے گرفتار ہو جانے کے بعد مسلم کانفرنس کی صدارت حمید اللہ خاں نے سنبھالی اور اپنی ساری سرگرمیوں کو چودھری غلام عباس کے کہنے پر اسمبلی کا الیکشن جیتنے پر مرکوز کر دیا۔ اس کی وجہ سے صوبہ جموں میں مسلم کانفرنس دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور یہی حالت سری نگر میں بھی ہوئی۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں مسلم کانفرنس کے لیڈر اسمبلی کی کرسیوں کے لیے آپس میں اُلجھ پڑے البتہ پونچھ اس غرض کا شکار ہونے سے محفوظ رہا، کیونکہ اہالیانِ پونچھ کے لیڈر خان محمد خان سابق ممبر اسمبلی جموں و کشمیر نے محسوس کیا کہ اب کم تعلیم یافتہ افراد کا اسمبلیوں میں جانے کا زمانہ نہیں۔ مجھے اپنی جگہ کسی نوجوان قانون دان تعلیم یافتہ کے لیے خالی کرنا چاہیے۔ اس لیے انھوں نے سردار ابراہیم خان بی اے، ایل ایل بی، بار ایٹ لاء کو جو اُس وقت کشمیر میں اسسٹنٹ ایڈوکیٹ جنرل کے عہدہ پر فائز تھے، کہا کہ آپ استعفیٰ دے کر اسمبلی کے لیے اُمیدوار کھڑے ہو جائیں۔ میں اپنی جگہ خود بخود چھوڑتا ہوں۔" چنانچہ اسی طرح سردار ابراہیم خان نے مسلم کانفرنس کا ٹکٹ لے کر الیکشن جیتا۔ (تاریخ آزادی کشمیر صفحہ ۲۵۶)

سیاسیاتِ کشمیر کے اس موڑ پر مسلم کانفرنس کے دونوں گروہ آپس میں اتحادِ فکر و عمل نہ کر سکے۔ وہ گروپ جو چودھری حمید اللہ خاں کے زیرِ اثر تھا، اس کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ یہ گروپ کبھی خود مختار کشمیر کا نعرہ بلند کرتا، کبھی شیر کشمیر شیخ عبداللہ کی تحریک کی مخالفت کرتا۔ اور کبھی اس کی طرف سے پاکستان سے الحاق کا نعرہ بلند ہوتا۔ برعکس اس کے مسلم کانفرنس کا دوسرا گروپ جو اسلامیانِ پونچھ پر مشتمل تھا، وہ ایک ٹھوس عملی کام کرنے کا خواہاں تھا، اور وہ ہر حالت میں جموں و کشمیر بشمول پونچھ کو ڈوگروں کی منحوس گرفت سے چھڑانے میں کوشاں تھا۔ چنانچہ جب

اس سلسلے میں سردار ابراہیم خان نے پونچھ کا دورہ کیا تو ڈوگرہ حکومت نے انہیں سختی سے روکا۔ کیونکہ حکومت یہ خطرہ بھانپ چکی تھی کہ اگر پونچھ میں ایک دفعہ بغاوت پھوٹ پڑی، تو پھر اُسے دبایا نہیں جا سکے گا اور بعد کے واقعات نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ آخر بغاوت کی آگ پونچھ ہی سے بھڑکی اور اِدھر اُدھر پھیلی جس نے اُن نواح میں ڈوگرہ اقتدار کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ لیکن جہاں تک مسلم کانفرنس کے اُس گروپ کا تعلق ہے جو چودھری حمید اللہ خاں کے زیر اثر تھا اور جسے چودھری غلام عباس کی امداد و اعانت حاصل تھی وہ بلا مقصد ہی "برسرِ پیکار" رہا۔ اور اس نے کسی میدان میں کچھ بھی نہ کیا۔ اُدھر پونچھ کی حالت نازک ہو رہی تھی اور مولانا غلام حیدر جنڈالوی، سردار محمد ابراہیم خان، خان محمد خاں اور دیگر مسلمان لیڈروں کی سرگرمیوں سے حکومت اتنی گھبرائی کہ اُس نے سردار محمد ابراہیم خان کا داخلہ پونچھ میں بند کر کے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی اور جب اس دفعہ کو توڑنے کے لیے اسلامیانِ پونچھ نے اعلان کیا تو بقول مولوی میر عالم خاں صاحب مصنّف "تاریخ آزادیٔ کشمیر"۔

قرآن کی قسم

"۲۲ جون کو چودھری حمید اللہ خاں قائم مقام صدر مسلم کانفرنس راولاکوٹ تشریف لائے، اور لوگوں کو دفعہ ۱۴۴ توڑنے سے مصلحتاً منع فرمایا۔ اس پر لوگوں کے شکوک بڑھ گئے۔ ہر چند چودھری صاحب تو مخلص اور نیک تھے، لیکن لوگوں کی بدظنی باتوں سے دُور نہ کر سکے۔ لوگوں نے الگ ایک جگہ بیٹھ کر قرآن درمیان رکھ کر حلفِ وفاداری لیا، اور خود بھی دیا۔ اس پر چودھری صاحب بڑے خوش ہوئے اور ان لوگوں کے اخلاص اور ایمان کو سراہا۔"

(تاریخ آزادی کشمیر صفحہ ۲۶۶/۲۶۷)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عوام میں اس گروپ کے خلاف شکوک بدرجہ اتم موجود تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سری نگر میں جب سردار ابراہیم خاں نے کھُل کر جموں و کشمیر سے پاکستان کے الحاق کا ریزولیشن پیش کیا تو انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ بات علیحدہ ہے کہ وہ نظر بندی کی حدود کو توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان آکر نہ صرف انھوں نے آزاد کشمیر حکومت کی ترتیب و تخلیق میں حصّہ لیا، بلکہ وہ مسلم کانفرنس کے ایک گروپ کے لیڈر بھی بن گئے۔

صوبہ جموّں خصوصاً جموں شہر میں جو واقعات رُونما ہوئے، اُن کی تفصیل سب پر عیاں ہے۔ مسلم کانفرنس کے سب لیڈر بھاگ گئے۔[1] اور کشمیر مسلم کانفرنس والوں نے ان سے عدم تعاون کیا۔ غرضیکہ اس نازک ترین مرحلے میں بھی یہ تینوں گروپ آپس میں اُلجھے رہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

جموّں شہر - شہر خموشاں بن گیا۔

وادیٔ کشمیر - بھارت کی گرفت میں چلی گئی۔

اور آزاد کشمیر - جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔

پھر پاکستان میں

مسلم کانفرنس کے مختلف گروپوں کی یہ آویزش یہاں ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ جب چودھری غلام عباس جموں جیل سے رہا ہو کر پاکستان تشریف لائے تو اختلافات نے پھر سر اُٹھایا۔

---

[1] اس نازک اور سنگین وقت میں اسلامیان جموں کی راہنمائی کپتان میاں نصیر الدین نے نہایت جرأت اور دلیری سے کی۔ مگر وہ تنہا تھے۔ اکیلے کیا کر سکتے تھے۔

اور مسلم کانفرنس کی قیادت اور آزاد کشمیر کی صدارت کے لیے باہمی کشمکش شروع[1] ہوگئی اور پچھلی کدورتیں اور رقابتیں پھر تازہ ہوگئیں۔ پہلے کی طرح جماعت تین حصوں میں تقسیم ہوگئی اور حکومت آزاد کشمیر ان تینوں میں کھیل کی گیند بن گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا رہا۔ اور اب ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ مانا کہ مسلم کانفرنس کے لیڈر بلاشبہ چودھری غلام عباس ہیں لیکن یہ کیا بات ہے کہ اُن کے ساتھی اور نائبین ہمیشہ ان کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کر دیتے ہیں، اندرونِ کشمیر بھی اور بیرونِ کشمیر بھی۔ اس سلسلے میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کا یہ بیان ہے کہ چودھری صاحب کے رفیق ان کو "دھوکا دیتے رہیں" مگر اُن کے رفقائے کار کا یہ بیان ہے کہ خود چودھری غلام عباس میں نہ تو فراخدلی ہے اور نہ ہی وسعتِ نظر۔ بلکہ ان کی ساری سیاست کا مرکز ان کی اپنی ذات ہے۔ یہ الزام

---

[1] سیالکوٹ میں تحریک حریت کشمیر کے بانی سردار گوہر رحمٰن خاں لودھی کے مکان پر عباس مسلم کانفرنس کے کارکنوں کا حملہ کرنا، اُن کے مکان کے سامان کو لوٹنا اور خود سردار صاحب ایسے بزرگ اور معزز سیاست دان پر لاٹھیوں سے یلغار کرنا "مسلم کانفرنس" کے "اخلاقی کردار" کی اچھی طرح وضاحت کرتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس واقعہ کے وقت چودھری غلام عباس سیالکوٹ میں موجود تھے۔ اور وہ اپنے بزرگ رہنما اور ممتاز قومی لیڈر کے شدید زخمی ہونے پر اُن کی عیادت تک کو نہ گئے۔ یعنی انھوں نے بحیثیت "سپریم ہیڈ آف دی آزاد کشمیر گورنمنٹ" کشمیر کے اس مقدم ترین سیاسی رہنما کو اُن کی قومی خدمات کا یہی صلہ دیا کہ وہ "دیارِ غیر" میں بے آسرا ہو کر رہ جائیں اور اُن کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

کہاں تک درست ہے، یہاں اس کی تصدیق یا تردید کی ضرورت نہیں لیکن ریاست کی جدوجہدِ آزادی کے سلسلے میں اب تک جو واقعات ہو چکے ہیں، ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ چودھری غلام عباس کے سیاسی کردار میں اُن خصوصیات کا فقدان ہے، جن کا کسی بڑے لیڈر میں ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے، یعنی قربانی، کشادہ قلبی، ایثار اور وسعتِ نظر۔

یہی وجہ ہے کہ وادیٔ کشمیر نے ان کی قیادت کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور جب قائدِ اعظمؒ کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے چودھری غلام عباس کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اگر ریاست جموں وکشمیر کا لیڈر بننا چاہتے ہیں تو پہلے کشمیری زبان سیکھیں، قائدِ اعظم کے اس ارشاد میں کہ وہ کشمیری زبان سیکھیں، بہت سے معانی پنہاں ہیں، لیکن بہر حال یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جموّں میں چودھری غلام عباس کا اثر ونفوذ اتنا ہی زیادہ تھا، جتنا وادی میں ان کا کم تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جموں شہر کے لوگ ان کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتے تھے، مگر تماشا یہ ہوا کہ اس شہر کے لوگوں نے بھی ان کی سیاسی حکمتِ عملی کے خلاف احتجاج کیا اور ان کی پالیسی کو ہدفِ تنقید بنایا اور اُن کو پیش آمدہ مسائل سے باخبر کیا مگر ؏

"زمین جنبد نہ جنبد گل محمدؐ"

کے مصداق اُن پر کچھ اثر نہ ہوا۔

جب چودھری غلام عباس پاکستان آئے، تو سردار محمد ابراہیم خاں نے ان سے اختلاف کیا، اور اپنی علیحدہ جماعت بنالی۔ پھر میر واعظ اُن سے الگ ہو گئے اور انھوں نے بھی اپنی علیحدہ جماعت بنا ڈالی۔ بعد میں کوئی آدھی درجن متفرق

سیاسی جماعتیں اُن کے خلاف بنیں۔ اُن کے ایک معتقد اور آل جموّں وکشمیر مسلم کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کے ایک بااثر رکن قاضی خورشید عالم نے جماعت کی بدعنوانیوں سے دل برداشتہ ہو کر علیحدگی اختیار کی اور مسلم کانفرنس کی جوڑ توڑ کی پالیسی کے خلاف "مسلم کانفرنس کے دستور پر سُرخ لکیر کیوں ——؟" کے عنوان سے پمفلٹ تحریر کیا۔ مسٹر اے آر ساغر نے ان سے بعض مسائل میں شدید اختلاف کیا۔ اور تو اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے نائب صدر اور حکومت آزاد کشمیر کے سابق وزیر خزانہ مولانا محمد حسین نے ان کے خلاف سیالکوٹ مسلم کانفرنس کے صدر ڈاکٹر غلام احمد کے نام ذیل کا خط تحریر کیا جس کی تشہیر بذریعہ اشتہارات و اخبارات تمام آزاد کشمیر اور پاکستان میں ہو چکی ہے۔

خط

مولوی محمد حسین — ۱۱۳۷۔ براؤن لاڈ سٹریٹ
فارمر منسٹر آف فنانس — راولپنڈی
آزاد کشمیر گورنمنٹ — ۲۸ را پریل ۱۹۶۱ء

عزیز القدر ڈاکٹر غلام احمد صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا خط مل گیا تھا۔ آجکل جناب خورشید صاحب ضلع سیالکوٹ کا دورہ فرما رہے ہیں۔ ہماری دلی دعا اور تمنّا ہے، خدا انھیں کامیاب کرے اور مجھے خدا کے گھر سے امید بھی ہے۔ امید ہے آپ کو مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا دعوت نامہ موصول ہو گیا ہو گا

لیکن میں اب کی بار ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شمولیت اس لیے نہیں کر سکتا کہ ۵ مئی کو ایبڈو کے سلسلے میں میری پیشی ہے۔ میں یہاں سے ۴ مئی کو اپنی کار پر پنڈی سے مظفر آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ میرا معاملہ کیسا بھی ہو جائے، میرا انشاء اللہ وہی پروگرام ہے، جو آپ کا ہے۔ آپ ذرا ہمت سے کام کریں اور اس "ظالم" کو خدا تعالےٰ سزا دے، جس نے ۱۵ سال سے مہاجرین سے بے انصافی کر کے صرف اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ بھرا ہے۔ اب بھی اپنے جہنم کی آگ کو بجھنے نہیں دیتا۔ مہاجرین کے نام کو استعمال کر کے انگار اپنے پیٹ میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس قدر لالچی اور حریص ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کی لالچ اور حرص اس کی قبر سے کتے گھاس کی شکل میں نکلے گی۔ اس کے حسبِ حال ایک شعر ہے ؎

سگِ دنیا بس از مُردن بھی دامنگیرِ دنیا ہو
کہ اس "کتے" کی مٹی سے بھی کُتا گھاس پیدا ہو

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت دے۔ ایمان کی سلامتی نصیب اور خاتمہ بالخیر کرے۔ اور ظالم کو ظلم کرنے سے روکے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے تازہ حالات سے آگاہ فرمائیں۔ عباس، راجہ حیدر خان، سردار قیوم نے کس قدر بیہودہ تقریریں کی ہیں۔ وہ آپنے اخبارات میں پڑھی ہوں گی۔ اب عباس نے ایک اور چکر چلایا ہے۔ اور جناب فیلڈ مارشل سے ملاقات کی درخواست کی ہے اور اپنی بے گناہی ظاہر

کرنا چاہتا ہے۔ راجہ حیدر خان اور قیوم کو بے وقوف بنا کر استعمال کر کے اب وہ اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتا ہے، جو شروع سے اُس کی فطرت ہے جی چاہتا ہے بہت جلد آپ کے پاس پہنچوں، مگر جون کے آخری عشرہ سے پہلے پہنچنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ سب دوستوں کو السّلام علیکم مفصّل حالات سے مطلع فرمائیں ــــ والسّلام

محمدؐ حسین عفی عنہ

اس خط میں مولوی محمد حسین مرحوم نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلے میں مَیں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چودھری غلام عباس کے دوستوں[1] اور ہم عصر سیاسیین کے پاس ان کی ذات سے

---

[1] گلہ مند اور شاکی دوست: ــــ سردار گوہر رحمٰن خان لودھی۔ مسٹر عبد المجید قریشی۔ عبداللہ بھلّی مسٹر غلام حیدر خان غوری۔ شیخ غلام قادر۔ منشی معراج الدین احمد۔ آغا شوکت علی خان۔ یوسف قریشی یوسف صراف۔ قاضی خورشید عالم۔ سردار رحمت اللہ وغیرہ ہم۔

گلہ مند اور شاکی رفقائے سیاست جو جموں و کشمیر میں پس پردہ تحریک چلاتے تھے:۔

مولوی رفیع الدین۔ منشی رحمت اللہ بٹ۔ منشی محمد طفیل۔ میاں غلام علی۔ حبیب کیفوی۔ منشی محمد صادق ڈاکٹر غلام احمد جراح اور ڈاکٹر عبد الکریم ملک۔ سید تاج شاہ وغیرہ ہم۔

اور نوجوانوں میں شیخ محمد مبارک، مجید امجد بٹ اور چودھری سلطان علی ہیں جنھیں چودھری غلام عباس سے علیحدہ ہونا پڑا ــــ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب حالیہ صدارتی الیکشن میں چودھری غلام عباسؒ اپنے امیدوار کی حمایت میں میدانِ عمل میں آئے تو اُن کے دوستوں اور پُرانے ساتھیوں ہی نے ان کی سب سے زیادہ مخالفت کی اور عہدِ ماضی کی تمام تلخیوں کا مداوا اسی میں جانا کہ مسٹر کے ایچ خورشید کو کامیاب بنائیں چنانچہ کشمیری عوام مقیم پاکستان زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سنے گئے ؎

نہ تم ٹوٹے ہوئے دل جوڑ سکتے ہو محبّت سے ۔۔۔ نہ تم شاہی کا جادو توڑ سکتے ہو سیاست سے
نہ تم طوفان کا رُخ موڑ سکتے ہو فراست سے ۔۔۔ نہ جانے کس لیے آخر امیرِ کارواں تم ہو

گلوں اور شکووں کے انبار جمع ہیں۔ اور تو اور گذشتہ دنوں چودھری حمید اللہ خاں مرحوم کی بیگم نے بھی چودھری غلام عباس کے طریق کار پر اظہارِ غم اور افسوس کیا۔

اقتدار عوام کو

ان اندوہناک حالات کی اصلاح کے لیے جو روز بروز زیادہ سے زیادہ خراب ہوتے جا رہے تھے۔ آزاد کشمیر کے صدر مسٹر کے ایچ خورشید نے آزاد کشمیر کی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں ایک نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور قانونی طور سے اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کر دیا، جن کو کہ عوام براہِ راست منتخب کرتے ہیں۔

اس طرح آخر کار نام نہاد مسلم کانفرنس کے اقتدار کا دور ختم ہو گیا۔ مسٹر کے ایچ خورشید کے اس اقدام کے خلاف بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خورشید صاحب نے شروع شروع میں مسلم کانفرنس کی اصلاح احوال کی ہر ممکن کوشش[1] کی۔ مگر چودھری غلام عباس نے دستِ تعاون نہ بڑھایا جس سے تنگ آکر آزاد کشمیر

---

[1] اس زمانے میں خورشید صاحب نے راقم الحروف کو ایک خط لکھا تھا جس کا پورا متن درج ہے

مظفر آباد

۱۶ ستمبر ۵۹ء

عزیزم کلیم اختر السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

چند دن ہوئے مجھے آپ کا خط ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ کثرتِ کار کی وجہ سے جلد جواب نہ لکھ سکا۔ (بقیہ بر صفحہ ۲۶۳)

کے عوام اور کشمیری عوام مقیم پاکستان کو "کشمیر لبریشن لیگ" کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا مقصد وحید وطن کی آزادی اور اُس کا پاکستان سے الحاق ہے۔

یہ تو تھی مسلم کانفرنس کی اجمالی روئداد۔ اب میں مختصراً "آزاد کشمیر" کے بارے میں کچھ لکھوں گا۔

(بقیہ صفحہ ۲۶۲ سے آگے) آپ نے اپنے خط میں جن حالات کا ذکر کیا ہے میں اُن سے اچھی طرح باخبر ہوں میری پوزیشن بالکل واضح ہے۔ میں نے ہمیشہ سیاست میں جماعتی زندگی کو پسند کیا ہے۔ اور میں نے اپنے تمام بزرگوں اور دوستوں سے کہا تھا کہ میرے لیے موجودہ پوزیشن قابل قبول نہیں جب کہ ملک میں سیاسی حالات نہ ہوں بلکہ ہنگامی حالات ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ملک میں باقاعدہ سیاسی زندگی ہو اور اگر یہ کام میری صدارت کے دوران ہی سرانجام پا جائے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہوگی۔

ہمارے بعض نادان دوست بعض پیشہ ور لیڈر اور بعض مخالف اس کوشش میں تھے کہ کے۔ ایل۔ ایم کو ایک الگ سیاسی پارٹی قرار دے کر اُسے مسلم کانفرنس کے مقابلے میں کھڑا کر دیا جائے اور جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی دو سیاسی پارٹیاں بنا دی جائیں۔ تاکہ اس طرح پیشہ ور کھڑپینچوں اور اُن لوگوں کو جن کا مقصد صرف باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانا ہے ایک زریں موقعہ میسّر ہو جائے۔ مگر میں نے بڑی سختی سے یہ اعلان کر کے کہ کے۔ ایل۔ ایم۔ الگ پارٹی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے۔

اور ہماری سیاسی جماعت مسلم کانفرنس ہی ہے۔ آخرکار سوچنے والوں کو اس بات کی طرف راغب کر ہی لیا۔ اور اس عنصر کی کوشش ناکام ہوگئی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ پالیسی اختیار کر کے میں نے جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو سیاسی انتشار سے بچا لیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جو لوگ اس پارٹی بازی سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے اب مایوس ہیں اور انہیں اتحاد کی شکل میں موت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُن کی کوشش یہی ہے اب اندرونی طور پر لیڈروں میں فرضی اختلاف اور انتشار پیدا کیا جائے۔

میرا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ اگر ہمیں سیاسی اتحاد ملحوظ ہے اور اگر ہم نے واقعی ترقی کرنا ہے تو اس کے لیے باہمی اتحاد اور اتفاق ناگزیر ہے اور اس لیے ہمیں چھوٹی چھوٹی ریشہ دوانیوں کی پروا نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میری آپ سے اور دوسرے دوستوں سے گذارش ہے کہ وہ ان فرضی جھوٹی اور من گھڑت داستانوں کی طرف توجہ نہ دیں۔ البتہ ایک بات ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اتحاد کے لیے میری کتنی ہی کوشش کیوں نہ ہو۔ اگر بعض بزرگ محض ذاتی رنجش اور فرضی شکایتوں کی بنا پر یا یہ سمجھ کر کہ اُن کی پوزیشن خطرے میں ہے کہ اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہ ہوگا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے نوجوان چند پیشہ ور لیڈروں کو جموں و کشمیر کے مسلمانوں کی قسمت کے ساتھ کھیلنے نہیں دیں گے۔ قوم اب زیادہ انتشار برداشت نہیں کر سکتی۔

میری گذارش آپ سے یہ ہے کہ جب کبھی جماعت میں تنظیم ہو تو آپ سب لوگ اس میں دل کھول کر اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور ہونہار اور قابل محبِّ وطن نوجوانوں کو سامنے لائیں۔ تاکہ ہم اس بھنور سے نکل سکیں جس میں ہماری کشتی بارہ سال سے پھنسی ہوئی ہے۔

امید ہے آپ بفضلہٖ بخیریت ہوں گے۔

میر رشید صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ اس لیے اُن سے ملاقات ہو گئی ہے۔ خواجہ اقبال صاحب کا خط مجھے کل ہی ملا ہے۔ اُن کی خدمت میں آداب کہیں۔ دیگر تمام دوستوں اور بزرگوں کو السلام علیکم۔

فقط

آپ کا مخلص

(خورشید حسن خورشید)

عزیزم کلیم اختر صاحب

محلہ پورن نگر

سیالکوٹ شہر

آزاد کشمیر

آزاد کشمیر

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

گذشتہ ابواب میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی دونوں سیاسی جماعتیں آزادیٔ ریاست جموں و کشمیر کے لیے برسر پیکار رہیں اور ایک طویل مدت تک ڈوگرہ شاہی کے خلاف ان کی یہ جنگ رہی۔ ان دونوں جماعتوں کے قائدین نے اپنی جدوجہد سے کیا حاصل کیا۔ وہ سب پر عیاں ہے، لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں جماعتیں ایک طویل مدت میں وہ کچھ حاصل نہ کر سکیں، جو مسلمانانِ پونچھ نے ایک مختصر سے عرصے میں اپنی جدوجہد سے حاصل کر لیا۔ یہ درست ہے کہ اس میں مسلمانانِ جموں و کشمیر کی قربانیوں کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔ اور آزاد کشمیر کی تاریخ کا وہ مصنّف بڑی بددیانتی کا مظاہرہ کرے گا اگر وہ آزاد کشمیر کی اساس ۱۹۳۱ء کو قرار نہ دے گا مگر اپنی جگہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آزاد کشمیر

کے علاقے پونچھ سے ہی جنگ کی آگ بھڑکی، اور وہ چنگاریاں جو عرصے سے سینوں میں سُلگ رہی تھیں ایک شعلے میں بدلیں۔ یہ کیسے ہُوا، اور مسلمانانِ پونچھ نے لوح و قلم چھوڑ کر بندوق کیوں سنبھال لی؟ یہ ایک سوال ہے جس کے جواب کے لیے ہمیں مسلمانانِ پونچھ کی ان دنوں کی ذہنی کیفیات کا سراغ لگانا ہوگا جب ہندوستان کے سیاسی افق پر دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مسلمان ریاست کا آفتاب اُبھر رہا تھا۔ اور پونچھ کے فوجی دوسری عالمگیر جنگ میں شرکت کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جیسا کہ پیشتر ازیں عرض کیا جا چکا ہے مہاراجہ کشمیر یہ چاہتا تھا کہ اُس کی ریاست تقسیمِ برّصغیر کے بعد آزاد و خود مختار رہے۔ اس خوش فہمی میں مست وہ حقائق اور پیش آمدہ مسائل سے بالکل بے خبر تھا، وہ اس خیال میں مگن تھا کہ اس کے یہ عزائم بڑی آسانی سے عملی جامہ پہن سکیں گے، لیکن اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ انھیں دنوں تحصیل سدہنتی (پونچھ) کا ایک وفد برطانوی کمانڈر انچیف سے ملا اور اسے اپنے علاقے کی پسماندگی اور حقوق کی پامالی سے آگاہ کیا۔ اور اس کو پونچھ کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ جب اس صورت حال کا علم مہاراجہ کشمیر کو ہُوا تو وہ گھبرا گیا اور اس نے کمانڈر انچیف کو لکھا کہ میں خود پونچھ کا دورہ کر کے تمام صورت حالات سے آپ کو آگاہ کروں گا۔ بقول مصنّف "تاریخ آزادی کشمیر" ـــــ

"چنانچہ مہاراجہ بحیثیت ریاست کے کمانڈر انچیف کے اپریل ۱۹۴۷ء راولاکوٹ پہنچا۔ ایک والی ملک کے لیے جو اس کی رعایا کے خیال ہونے چاہئیں، اس کے مطابق بڑھ چڑھ کر استقبال کیا گیا۔ دُور دُور کے فوجی آفیسر اور فوجی عہدہ دار سپاہی بڑے اہتمام سے آئے اور انتظام

گیا۔ پبلک کے لوگ متوقع تھے کہ مہاراجہ ہماری طرف بھی آئے گا۔ سلامی لے گا۔ حالات پوچھے گا۔ اتنے میں مہاراجہ کی جیپ نمودار ہوئی۔ سیدھی اس کیمپ کی طرف چلی گئی، جہاں اس کے پلٹن کے چند آدمی کھڑے تھے وہاں جاکر رُک گئی۔ مہاراجہ نے کچھ استفسار کیا۔ اور واپس ڈاک بنگلہ چلا گیا۔ ہمارے فوجیوں کا نہ سلام لیا اور نہ متوجہ ہوا۔ مسلمانوں کے دلوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔"

(تاریخ آزادیٔ کشمیر ص ۲۵۹)

نفرت کا آغاز یہی بات مسلمانانِ پونچھ اور فوجی نوجوانوں کے دلوں میں مہاراجہ کشمیر کے خلاف نفرت کی فوری وجہ ثابت ہوئی، اور انھوں نے درونِ پردہ اپنی فوجی تنظیم شروع کر دی۔ اس پر حکومتِ پونچھ نے مجاہدین کے لیڈروں کو گرفتار اور نظربند کرنے کا آغاز کر دیا، مگر اس کے باوجود کارکنان برسرِ عمل ہی رہے حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ اور اُنھی دنوں حکومت کے مظالم کا ایک شکار سید خادم حسین شاہ ہوئے، جن کو گولی مار کر شہید اور اُن کے گھر کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ۱۹ ؍ اگست ۱۹۴۷ء کو دفعہ ۱۴۴ توڑ دی گئی۔ باقاعدہ فوجی ٹریننگ کی جانے لگی۔ اور حکومت کے خلاف جلسے منعقد ہونے لگے۔

الغرض مسلمانانِ پونچھ اور ڈوگرہ حکومت کے درمیان باقاعدہ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اس اثنا میں سردار ابراہیم خاں سری نگر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو کر پاکستان آگئے اور انھوں نے ریاست کے حالات کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے پروگرام بنانے کے لیے کام شروع کر دیا چنانچہ مصنّف "آزادیٔ کشمیر" مولوی میر عالم خان صاحب

کا بیان ہے :-

"سردار محمد ابراہیم خان نے بمقام مری ایک اہم اجلاس طلب فرمایا؛ جس میں جموں و کشمیر کی سفاک اور ظالم حکومت کے خلاف جہاد کا عملی قدم اٹھانے کی تجویز سوچی جائے۔ چنانچہ اس میں پاکستان کے مقتدر مسلمان بھائیوں کے علاوہ پونچھ، باغ، سدھنتی کے مندرجہ ذیل اصحاب شامل اجلاس تھے کیپٹن حسن خان کالاکوٹ۔ سردار عبد القیوم خان باغ۔ صوبہ دار افضل خان منگ۔ صوبیدار بوستان خان لنڑ۔ صوبیدار بوستان خان (ہاڑہ) جمعدار افسر خان تھواڑہ۔ مولوی غلام حیدر خان جنڈالوی۔ اس اجلاس میں اہم تجویزیں پاس کی گئیں۔ اور کس طرح اور کن کن راستوں سے ہتھیار چڑھائے جائیں گے اور انہیں کن کن مقامات پر اور کن کن آدمیوں کی نگرانی میں رکھا جائے گا۔ کس کس کی ماموری اور کس تاریخ کو حملہ ہوگا۔"

(تاریخ آزادی کشمیر صـ ۲۸۶)

اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ اب آئینی طریق ترک کر دیا جائے اور ریاست جموں و کشمیر کو بزورِ شمشیر ظالم ڈوگروں سے چھڑایا جائے۔

چنانچہ جنگ کے لیے سیکٹروں کی تقسیم یوں کی گئی:-

سیکٹر نمبر ۱ ـــــ مظفر آباد سے گلگت تک

سیکٹر نمبر ۲ ـــــ کوہالہ سے میرپور تک

سیکٹر نمبر ۳ ـــــ میرپور سے جہلم اور سیالکوٹ کی حد تک

اور ان سیکٹروں کی نگرانی کے لیے مندرجہ ذیل اصحاب و مجاہدین مقرر کیے گئے:-

۱۔ سردار عبدالقیوم خاں اور پیر علی اصغر شاہ صاحب

۲۔ کیپٹن حسین خاں۔ کیپٹن رحمت اللہ خان۔ صوبیدار بوستان خان ہاڑہ۔

۳۔ خان محمد خان۔ کیپٹن چنوں خان اور کیپٹن حسین خان گوارہ

جموں و کشمیر پر حملہ کے اس نقشہ کے بارے میں بھارتی وزارتِ داخلہ اور ریاستی امور کے سیکرٹری مسٹر وی۔ پی مینن کا یہ خیال ہے۔

"جن لوگوں نے یہ نقشہ جنگ بنایا تھا، ان کی ذہانت اور سوجھ بوجھ قابلِ تعریف ہے، جس سرعت اور تیزی سے اپنے پروگرام کو یہ بروئے کار

ل پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی مشہور سیاسی و تاریخی کتاب "ہسٹری آف دی سٹرگل فار فریڈم ان کشمیر" میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اعلان کو تاریخی اعلان بتایا، اور اسے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور سے نقل کرتے ہوئے کتاب مذکور میں لکھا ہے:۔

"کشمیری عوام نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور عارضی حکومت کا قیام بمقام مظفر آباد عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ تاریخی اعلان ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا، جسے باشندگانِ کشمیر نے پرجوش جذبات سے سنا۔ (صفحہ ٦٢٠)

پنڈت پریم ناتھ بزاز، میر عبدالعزیز مدیر "انصاف"، مشتاق قریشی اور مسٹر فیاض عباسی مدیر پاک کشمیر کی تحقیق یہ ہے کہ ۲۴ اکتوبر کو مظفر آباد میں جو حکومت قائم ہوئی اس کے صدر خواجہ غلام نبی گلکار انور تھے، جو تحریک آزادی کشمیر کے اولین معماروں میں سے ہیں اور آزادی وطن کے سرگرم لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق مورخ کشمیر محمد اسداللہ قریشی کاشمیری نے بھی کی ہے۔ دوسرے انور جو جنگِ کشمیر میں شریک رہے، بلکہ وہ ایک محاذ پر قیادت بھی کرتے رہے۔ خورشید انور سالار نیشنل گارڈ تھے، جن کا اب انتقال ہو چکا ہے (مصنف)

لائے وہ بھی قابلِ تحسین ہے"۔

مصنف "آزادیٔ کشمیر" نے اس نقشہ اور اجلاس میں شرکت کرنے والے پاکستانی مقتدر اراکین کے نام نہیں لکھے مگر مسٹر ڈی۔ پی مینن مُصر ہیں۔ کہ

"قبائلی حملہ آوروں کا قائد ایک پراسرار پاکستانی آفیسر تھا، جو جنرل طارق کے نام سے مشہور تھا۔ بعد میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ پاکستانی افواج کے چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل اکبر خاں تھے، بعد میں ان کی جگہ میجر جنرل شیر خاں نے لے لی۔ ان لوگوں کی مدد بڑی قابلیت کے ساتھ محمد زمان کیانی۔ برہان الدین اور انڈین نیشنل آرمی کے سابق آفیسر کر رہے تھے۔" (کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی)

صرف یہاں تک ہی نہیں بلکہ مسٹر وی۔ پی مینن کا یہ بھی خیال ہے کہ اس نقشہ جنگ کو ترتیب دینے کا علم حضرت قائدِ اعظمؒ کو بھی تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خیال کا اظہار یوں کرتا ہے۔

"کشمیری فوج کے مسلمان سپاہیوں کا یک بیک غائب ہو جانا اور ٹھیک نفسیاتی لمحہ پر (قائدِ اعظمؒ) جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری خورشید کا سری نگر پہنچنا اور خود (قائدِ اعظمؒ) جناح کا لاہور میں موجود رہنا، کسی اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔"

(کشمیر اور جوناگڑھ کی کہانی)

اس سلسلے میں جب راقم الحروف نے حضرت قائدِ اعظمؒ کے سیکرٹری اور حکومتِ آزاد کشمیر کے صدر مسٹر کے ایچ خورشید سے استفسار کیا تو اُنھوں نے فرمایا:

"۔۔۔۔ ابھی میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ میں جس مقصد کے لیے کشمیر گیا تھا، اُسے پبلک کے سامنے رکھا جائے۔"

(اقتباس خط بنام راقم مؤرخہ ۹ جولائی ۱۹۶۲ء)

آزاد کشمیر کے بارے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز نے نہایت فراخدلی سے اس حقیقت کو یوں تسلیم کیا ہے ۔۔۔۔

"بھارت کے رجعت پسند ہندوؤں کا خیال ہے کہ آزاد کشمیر تحریک لٹیروں۔ باغیوں اور قاتلوں کی منظم غارت گری کا دوسرا نام ہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ہندو کشمیری مسلمانوں کے جمہوریت پسندانہ رجحانات کی اس زمانہ سے کڑی مخالفت کر رہے ہیں۔ جب آزادی کے متوالوں نے پہلی بار ۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ سامراج کے خلاف سر اٹھایا تھا۔"

(آزاد کشمیر از بزاز ص۵)

اس سے آگے چل کر پنڈت بزاز لکھتے ہیں ۔۔۔۔ کہ ۔۔۔۔

"۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۹ء تک یہی ہندو طبقہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو ہدفِ تنقید و ملامت بناتا رہا ہے۔ بہت سے لوگ تو کشمیر کی جنگ شروع ہونے تک نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو حقارت اور نفرت سے یاد کیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہی لوگ شیخ عبداللہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اور آزاد کشمیر کی خدمت میں پیش پیش ہیں"۔ (آزاد کشمیر ص۸)

۔۔۔۔ اب پھر وہی لوگ شیر کشمیر محمد عبداللہ کے خلاف زہر اگل رہے ہیں اور آزاد کشمیر کے خلاف بھی برسرِ پیکار ہیں ۔۔۔۔ "انقلابات ہیں زمانہ کے"

مسلمانانِ جموّں کا قتلِ عام

جنگ آزادیٔ کشمیر کا نقشہ چاہے کسی نے بنایا ہو۔ مگر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مجاہدینِ کشمیر نے اپنے پاکستانی بھائیوں کی معاونت سے ڈوگرہ فوجیوں کے چھکے چھڑا دیے اور ریاست جموں و کشمیر کے ایک خاصے حصّے پر قبضہ کرلیا، اور جب مجاہدین کشمیر سری نگر سے صرف چار میل کے فاصلہ پر رہ گئے تو بھارتی افواج ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر پہنچ گئیں۔ اور اِدھر مہاراجہ کشمیر نے جموں جاکر مسلمانانِ جموّں کے قتلِ عام کا حکم دے دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی الحاق کے لیے لارڈ مونٹ بیٹن کو خط تحریر کردیا۔ درحقیقت یہ سب کچھ بھارت اور مہاراجہ کشمیر کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا۔

اُدھر آزاد کشمیر میں جنگ شروع ہوئی، اِدھر ہندوؤں نے جموّں کے اردگرد کے دیہات کے مسلمانوں کا صفایا کرنے کا آغاز کردیا۔ مردوں کو تہ تیغ کیا گیا، اُن کی عورتیں اغوا کرلی گئیں۔ بچوں کو قتل کرکے نیزوں پر اُچھالا گیا۔ اور مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔ ۲۵ راکتوبر کو راجہ صُحبت علی شہید کردیے گئے اور شہر میں مسلمانوں کا محاصرہ کرکے چاروں طرف سے اُن پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ ۵ رنومبر کو جموں کے مسلمانوں کو دھوکے سے پولیس گراؤنڈ میں جمع کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ پاکستان جانے کے لیے تیار ہوجائیں۔ چنانچہ ۹ بجے صبح ۶۰ لاریاں اُن کو لے کر روانہ ہوئیں۔ اور کٹھوعہ روڈ پر لے جاکر اُن میں جتنے بھی مسلمان تھے اُنھیں قتل کردیا گیا۔ اسی طرح ۶ رنومبر کو بشناہ روڈ پر دوسرے قافلے کے افراد کو شہید کیا گیا۔ تیسرے روز جب باقی ماندہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس سفّاکی کا علم ہوا تو اُنھوں نے لاریوں میں سوار ہونے سے انکار

کر دیا اس پر ڈوگرہ اور بھارتی فوجیوں نے اُن کا پانی بند کر دیا۔ چوتھے روز ایک مدراسی فوجی کو مسلمانوں کی حالتِ زار پر رحم آیا اور اس سے یہ ظلم نہ دیکھا گیا چنانچہ اس نے پانی کھول دیا، اور اس طرح پیاسوں کو پینے کے لیے پانی ملا، باقی بھوکے تو وہ ایک ہفتہ سے تھے۔

پاکستان میں ردِ عمل مسلمانانِ جموّں کے قتلِ عام کی خبر پاکستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی خصوصاً قبائل سرحد آندھی کی طرح ریاست جموّں و کشمیر کے اردگرد پھیل گئے۔ مسلمانانِ پاکستان کا یہ ردِ عمل فطری تھا۔ وہ یہ کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے بالکل قریب فرزندانِ توحید اس طرح بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹے جائیں۔ ان کی اسلامی غیرت و حمیت نے جوش مارا۔ اور سرحد کے مجاہد مجاہدینِ وطن کے دوش بدوش اس جنگِ آزادی میں کود پڑے چنانچہ ڈوگرہ افواج لگاتار پیچھے ہٹتی گئیں۔ اور سری نگر کے "گپکار محل" میں سردار پٹیل کا سیکرٹری مسٹر وی پی مینن گزشتہ تاریخ کے صفحات کو اپنے ذہن میں لا کر اس باب کو دیکھنے لگا جب محمود غزنوی نے سومنات کو سر کیا تھا۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر وی۔ پی مینن لکھتا ہے:۔

"کشمیر پر قبائلیوں کا حملہ ہندوستان کی سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ محمود غزنوی کے وقت سے لے کر تقریباً آٹھ سو سال تک ہندوستان شمال مغرب کے حملہ آوروں کی تاخت و تاراج اور یلغار کی آماجگاہ بنا رہا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر لگاتار سترہ حملے کیے اور پاکستان قائم ہونے کے صرف دس ہفتے کے اندر سب سے پہلا کام اس نئی حکومت نے جو کیا وہ یہ تھا کہ شمال مغرب سے حملہ آوروں کو پیش قدمی کی اجازت دے دی۔ آج سری نگر، کل دہلی۔ جو قوم اپنی تاریخ اور جغرافیہ کو فراموش کر دے وہ اپنی

تباہی کی خود ذمّہ دار ہے ——" "ریاستوں کی کہانی۔ صفحہ ۲۹۱)

مجاہدین کی ان پیش قدمیوں کو دیکھ کر بھارت نے اقوام متحدہ کی طرف رجوع کیا، اور پاکستان کے خلاف ریاست پر حملہ آور ہونے کا الزام لگایا لیکن پاکستانی نمائندہ چودھری ظفر اللہ خان نے اس الزام کی پُرزور تردید کی اور اصل حقائق سے اقوام عالم کو آگاہ کیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے۔ پاکستان کے وفد میں سردار محمد ابراہیم خان کے ساتھ ڈاکٹر محمد دین تاثیر بھیجے گئے تھے جنھیں شیخ محمد عبداللہ کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا تھا۔ یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ دونوں دوست ایک عالمی عدالت میں مدِّ مقابل کھڑے تھے۔ یہاں یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اس وقت تاثیر کشمیر مجبور تھے۔ اور ان کی حالت ؎

دروغ مصلحت آمیز ہے مجبور کا مذہب

یہاں ظالم کو اکثر مہربان کہنا ہی پڑتا ہے

طویل بحث و تکرار کے بعد سلامتی کونسل نے ۲۳ راپریل کو پانچ ارکان پر مشتمل ایک مصالحتی کمیشن کشمیر بھیجنا تجویز کیا۔ اُس وقت کشمیر کی حالت یہ تھی کہ ادھر پونچھ میں ۲۰ ہزار سے زائد مسلح بھارتی اور ایک ڈوگرہ بریگیڈ مجاہدین کے گھیرے میں تھا۔ اور اُدھر سری نگر سے چند ہی میل دور مجاہدین پڑے ہوئے تھے۔ غرضیکہ ہماری پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ اور حضرت قائداعظم رح بقید حیات تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ کے نشیب و فراز کو اچھی طرح جانچ لیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کا مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے۔ بلکہ وی۔ پی مینن نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مسٹر جناح چاہتے تھے کہ پاکستان خود کشمیر پر حملہ کر دے۔

اس بارے میں مینن لکھتا ہے :۔

"اس اثنا میں مسٹر جناح لاہور میں تھے۔ اور سخت پریشان تھے۔

............ان کے پرائیویٹ سیکرٹری خورشید سری نگر میں موجود تھے۔ ہندوستانی افواج کی آمد کے بعد انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ پھر وہ پاکستان بھیج دیے گئے۔ جناح کے کانوں تک جیسے ہی یہ خبر پہنچی کہ انڈیا نے جموں و کشمیر کا الحاق تسلیم کر لیا ہے اور ہندوستان کی فوجیں طیاروں کے ذریعے سری نگر بھیج دی گئی ہیں، انھوں نے پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو حکم دیا کہ فوراً کشمیر میں فوجیں اتار دیں۔ گریسی نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ سپریم کمانڈر کی منظوری کے بغیر اس سلسلہ میں وہ کوئی ہدایت نامہ جاری نہیں کر سکتے۔"

"فیلڈ مارشل ایکن لک ۲۸ اکتوبر کو بذریعہ طیارہ دہلی سے لاہور گئے اور جناح کے سامنے صورت حالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر پاکستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہوئیں۔ جو اب قانونی طور پر ہندوستان کا حصّہ ہے، تو پاکستان آرمی میں کام کرنے والا ہر انگریز افسر فوری اور قطعی طور پر ملازمت سے علیحدگی اختیار کرے گا۔ آخر جناح نے کشمیر میں پاکستانی فوج کے داخلہ کے متعلق اپنا حکم واپس لے لیا۔" (ریاستوں کی کہانی)

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ قائد اعظمؒ کشمیری عوام کی پوری مدد کرنا چاہتے تھے اور وہ کشمیریوں کے لیے بڑے پریشان اور مضطرب تھے انھوں نے کشمیری مہاجرین کی امداد و اعانت کے لیے جو احکام نافذ فرمائے، مہاجرین انھیں کبھی

لے مسٹر کے۔ ایچ خورشید صدر آزاد کشمیر حکومت۔

نہیں بھولیں گے اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اگست میں جنگ بندی کے ریزولیوشن کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر شومئی قسمت ۱۱ ستمبر کو حضرت قائدِ اعظمؒ انتقال فرما گئے اور پھر پاکستان کی حکومت اُن اقدامات کی پیروی نہ کر سکی۔ جن پر حضرت قائدِ اعظمؒ مُصر تھے۔

جنگ بندی

حضرت قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد مسئلہ کشمیر کا سب سے زیادہ حسرت ناک حصّہ شروع ہوتا ہے۔ بھارت کو حضرت قائدِ اعظمؒ کی شخصیّت کا جو خوف تھا، وہ دور ہو گیا اور قائدِ اعظمؒ کی وفات سے پاکستان کو جو صدمہ پہنچا تھا، اُس سے حکومت ہند نے یہ فائدہ اٹھایا کہ حیدر آباد پر حملہ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ برعکس اس کے پاکستان کی حکومت صلح کن پالیسی پر کاربند رہی، اور اقوام متحدّہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اُس نے اُس وقت جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیے، جب پونچھ کا علاقہ بھارت کو مل چکا تھا۔ اب بھارت کو کسی مزید چیز کا لالچ نہ تھا۔ ریاست جموں و کشمیر کا سب سے اچھا علاقہ اس کے پاس تھا اور ہندوؤں کا ایک فرد بھی آزاد کشمیر میں موجود نہ تھا۔ جس کے تحفّظ کے لیے وہ اقوام متحدہ کی قرار دادوں پر عمل کرتا۔ اس طرح حکومت پاکستان اپنی انتہائے سادگی سے ہندوؤں کی شاطرانہ سیاست سے مات کھا گئی!!!

اس صورت حال کا پاکستان میں بڑا سخت ردّ عمل ہوا اور خان لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان نے محسوس کیا کہ پاکستان کے عوام کو جنگ بندی کا معاہدہ پسند نہیں، اور وہ اس سے بہت ناراض ہیں۔ چنانچہ وی۔ پی مینن کے الفاظ میں انھوں نے بھارتی حکومت کو بتایا کہ

مسٹر لیاقت علی خان نے بھارتی حکومت کو کہا کہ ـــــ "اردو اخبارات اب

بھی اس پر (لیاقت علی) سخت و شدید حملے کر رہے ہیں۔ اور الزام لگا رہے ہیں کہ وہ آزاد کشمیر حکومت کی مدد نہیں کرتی۔ عام طور پر یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ایک زیادہ سخت اور مضبوط حکومت پاکستان میں موجودہ حکومت کی جگہ ہونی چاہیے۔" (وی۔ پی مینن)

بہت ممکن ہے کہ اُس وقت پاکستان کی مالی اور اقتصادی حالت ایسی نہ ہو کہ وہ ہندوستان سے کھلم کھلا لڑ سکتی۔ بہر حال جنگ بندی کا معاہدہ کرنے کی خواہ کوئی بھی وجہ ہو، لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اس کی وجہ سے پاکستان کی سالمیت کو شدید نقصان پہنچا۔ نیز ریاست کے ایک بڑے حصّے پر بھارت کا فوجی قبضہ ہو گیا۔ جنگ بندی کے نتیجے میں پاکستان کی رائے عامہ اتنی مشتعل ہو گئی تھی کہ حکومتِ پاکستان کی وزارتِ داخلہ نے چٹھی نمبر (1) 50/196/51-POLL بتاریخ ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے مطابق مسٹر جسٹس محمد منیر اور مسٹر اختر حسین فنانشل کمشنر پر مشتمل جو کمیشن لیاقت قتل کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں، وزیر اعظم پاکستان مسٹر لیاقت علی خاں کا قاتل سید اکبر کو قرار دیتے ہوئے اس قتل کی یہ وجوہات لکھیں۔

۱۔ سید اکبر نے وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کو دماغی توازن کے بگڑنے پر قتل کیا۔

۲۔ سید اکبر نے وزیر اعظم پاکستان کی کشمیر پالیسی سے نالاں ہو کر یہ قدم اٹھایا۔

۳۔ سید اکبر نے شدید مذہبی جنون میں آ کر یہ سنگین جرم کیا۔

(رپورٹ قتل لیاقت علی خاں صفحہ ۱۸)

اس سلسلے میں سید اکبر کی بیوی ململ بی بی کا یہ بیان بھی قابل غور ہے :-

"سید اکبر نہیں چاہتا تھا کہ وزیر اعظم پاکستان کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کریں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وزیر اعظم اس کانفرنس میں شریک نہ ہوتے تو کشمیر پاکستان کو مل جاتا تھا۔ سید اکبر اس بات کو وزیر اعظم کی کمزوری پر محمول کر رہا تھا کہ وہ کیوں بھارت کے خلاف جہاد شروع نہیں کرتے وہ وزیر اعظم کی کمزور پالیسی کے خلاف تھا" (رپورٹ ہذا صفحہ ۱۷)

الغرض وزیر اعظم پاکستان مسٹر لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد آج بھی کشمیر کا مسئلہ بین الاقوامی طور سے اسی مقام پر ہے، جہاں کہ مرحوم چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد گو کئی کمیشن آئے اور گئے مگر ہر کمیشن کی مساعی "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ البتہ اب مسئلہ کشمیر نے جو کروٹ لے رکھی ہے، وہ زیادہ تر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی جرأت اور ایثار کی مرہونِ منّت ہے، جس نے بھارت سرکار سے اُلجھ کر اس جامد و ساکت مسئلہ میں پھر حرکت و توانائی پیدا کی ہے غرضیکہ مختلف نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد کشمیر کی کہانی پھر اسی کردار پر آن پہنچی ہے جس نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔ آج سے رُبع صدی پیشتر۔

پھر وہی کُنجِ قفس

مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فاوسٹ ایک مقام پر کہتا ہے —

—— "اگر تو کبھی بہلا پھسلا کر مجھے میری زندگی سے مطمئن کر دے اور عیش و عشرت سے دھوکا دے دے تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں یہ شرط لگاتا ہوں کہ اگر میں کسی لمحہ کو مخاطب کر کے کہوں۔ ذرا

ٹھہر جا تو کتنا حسین ہے"۔ تب تجھے اختیار ہے کہ مجھے طوق و سلاسل میں جکڑ کر قعرِ مذلت میں دھکیل دے۔

گزشتہ صفحات میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سیاسی زندگی کے کسی لمحہ کو بھی آج تک کہ "ذرا ٹھہر جا تو کتنا حسین ہے" نہیں کہا۔ بلکہ یہی کہا کہ اے لمحو! آگے بڑھو اور حسین دنیا کو قریب لے آؤ۔ جس میں تمام ریاستی عوام امن۔ چین اور مسرّت سے زندگی بسر کریں۔ برعکس اس کے ہمیں اس داستانِ جدّوجہد میں وہ سیاسی کردار بھی ملتے ہیں، جنھوں نے اکثر یہ کہا۔ کہ اے حسین لمحو! ٹھہرے رہو تاکہ "خوانِ گدا" جاری رہے ان کی بلا سے کشمیر کی حسین وادی جھلستی اور مہاجرین تڑپتے رہیں، اور اُن پر چاندنی کڑی دھوپ بن کر چھائی رہے۔

اگست ۱۹۵۳ء کو جیسے ہی شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو بھارت کی حکومت نے معزول کر دیا وادی میں گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ جس سے اقوامِ عالم کے خوابیدہ ضمیر میں بھی ایک ہلچل پیدا ہوئی۔ دہلی اور کراچی میں اضطراب پھیلا۔ وزیرِ اعظم پاکستان مسٹر محمد علی بوگرا دہلی گئے اور پنڈت نہرو کو وہ قراردادیں یاد کرائیں جو سلامتی کونسل پاس کر چکی ہے۔ سلامتی کونسل میں ایک بار پھر کشمیر کی صدا گونجی اور سویا ہوا مسئلہ پھر جاگ اُٹھا۔ کشمیر میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اس پر اظہارِ غم کرتے ہوئے پنڈت پریم ناتھ بزاز کو اپنے اخبار "وائس آف کشمیر" میں یہ لکھنا پڑا۔

"حکومتِ مقبوضہ کشمیر ان فسادات کی تحقیقات کرانے کی جرأت نہیں رکھتی، جو شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد ریاست میں رونما ہوئے، اس لیے کہ موجودہ حکومت ہر دلعزیز حکومت نہیں ہے۔

بلکہ بھارتی سنگینوں کے سہارے برسرِ اقتدار ہے۔ اگست ۵۳ء میں رونما ہونے والے فسادات میں حکومت مقبوضہ کشمیر نے گولی چلائی جس کے نتیجہ کے طور پر بارہ سو افراد ہلاک ہوئے۔

اگر بخشی غلام محمد نہایت خلوص سے یہ اعلان کرتے تو لازمی طور پر وہ ان فسادات کی تحقیقات کے لیے غیر جانبدارانہ کمیشن کے تقرر کے سلسلہ میں فوری اقدامات کرتے۔ بلکہ مرزا افضل بیگ کی پارٹی کے ارکان کو اس کمیشن کی رکنیت کی دعوت بھی دیتے لیکن انھوں نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا۔ اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا، مگر کشمیر کی آزادی کے بعد ایک دن ایسا آئے گا جب ان واقعات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرانی پڑے گی اس لیے کہ یہ تحریک آزادیٔ کشمیر میں ایک اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ عوام سے دھوکہ دہی زیادہ عرصہ کارگر نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف بخشی غلام محمد اور ان کے کارندوں ہی کا کام ہے کہ وہ ذمہ دار عہدوں پر متمکن ہوتے ہوئے اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ بیانات دے سکتے ہیں۔ تاہم اس وقت ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ فریب کاری کا دوسرا نام بخشی ہے"۔

جب شیخ محمد عبداللہ جیل میں تھے تو بھارت کے سبھی لیڈروں اور سرکاری عہدے داروں نے ان کو اپنے شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے مسلک سے نہیں ہٹے۔ اور قید میں رہنا منظور کیا۔ درحقیقت شیر کشمیر کی قید بھارت کی بین الاقوامی ساکھ پر ایک بدنما داغ ہے۔ جب دنیا نے بھارت کو اس کے اس سنگین اقدام پر لعن وطعن کی تو اس نے شیخ عبداللہ سے سمجھوتہ کی کوشش کی، مگر اُن کا یہ

خوابِ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آخر پنڈت نہرو نے یہ سوچا کہ پانچ برس کی طویل اسیری کے بعد شاید وہ انھیں پھر اپنے ڈھب پر لا سکیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ان کو رہا کر دیا۔ مگر جب اُنھوں نے جیل سے نکلتے ہی اس سوال پر کہ

" آپ کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا ———؟"

بھارت کی نیم سرکاری نیوز ایجنسی پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے نمائندے کو کہا۔

" تمام لوگ میرے نظریات سے واقف اور آشنا ہیں، مگر قدرتی طور پر چونکہ عوام ہی آخری ثالث ہیں، اس لیے میں ان کے جذبات اور رجحانات جانے بغیر خود کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میں کچھ بھی نہیں، جب تک میں خود عوام کے احساسات نہ جان لوں۔ میں کیا بتا سکتا ہوں جب میں ان کے خیالات سے آگاہ ہو جاؤں گا، پھر کسی نتیجے پر پہنچ سکوں گا، جسے میں افضل اور عمدہ تصوّر کروں گا۔"

کہ جیل سے رہا ہوتے ہی اُنھوں نے یہ بھی کہا ———

——— " میرے پاس کوئی بندوقیں نہیں ہیں، جن سے عوام کو مرعوب کر سکوں۔ میرے پاس عوام کو رشوت دینے کے لیے دولت اور روپیہ نہیں ہے۔ میں صرف ایک نمائندہ ہوں۔ میں خود کچھ بھی نہیں ——— مجھے ہر حالت میں عوام کے پاس جانا ہے۔"

اُمید کی کرن

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی رہائی پر غیر ملکی اخبارات نے تبصرے کیے۔

" شیخ محمد عبداللہؒ جو اپنے آبائی وطن کشمیر میں ایک قوّت اور ایشیا

کے اہم ترین سیاسی قیدیوں میں سے ایک ہیں، آج ۵ بجے شام ایک آزاد فرد بن گئے ۔"

یہ نیویارک ٹائمز کی ۸ رجنوری کو سری نگر سے ارسال کردہ ایک اطلاع کا سرِعنوان تھا۔

"نیویارک ہیرلڈ ٹربیون" نے لکھا۔

"اب دیکھنا یہ ہے کہ شیر کی زنجیریں ٹوٹنے کے بعد "لرزاں کشمیر" کو ہندوپاک کے مابین تقسیم کر دینے پر مجبور کیا جائے گا جس کی اقوام متحدہ میں بھی مخالفت ہوتی ہے اور جسے کبھی عوام کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اب کیا اس مسئلہ کو اتنا طول دیا جا سکے گا۔" ۱۳-۱-۵۸

ٹائمز لنڈن نے لکھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ اس قید نے ہمیشہ ہی بھارتیوں کو پریشانی اور اضطراب کی حالت میں مبتلا رکھا ہے۔ بہرطور کشمیر پر بھارت کا حق یا اثر زائل ہوچکا ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی قید کے بارے میں یہ کہنا کہ اس اسیری کے لیے کوئی دلیل نہیں سنی جائے گی، بھارت پر ایک بدنما داغ ہے اور اب تو یہ امر یقینی ہے کہ شیخ عبداللہ کی رہائی کے بعد کشمیر میں سیاسی آزادی کا مطالبہ زیادہ زور اور ترقی پکڑے گا۔"

ایک اور برطانوی اخبار ڈیلی ایکسپریس نے لکھا۔

"یہ رہائی ہندوستان کی نیک نامی کے لیے اچھی مثال ہے اب بھارت کو صرف قدم اور آگے بڑھا کر کشمیر میں رائے شماری کرا ہی دینی چاہیئے۔

تاکہ یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے۔"

پاکستان کے وزیرِ اعظم ملک فیروز خان نون نے کہا۔

"شیخ محمد عبداللہ کی رہائی سے مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔"

جہاں تک شیخ محمد عبداللہ کا تعلق ہے اُن کا خود اپنی رہائی کے بارے میں یہ خیال تھا:۔

"میری یہ خواہش ہے کہ مجھے کوئی ایسا موقعہ میسّر آئے جس کی مدد سے میں بھارت اور پاکستان کے مابین مسئلہ کشمیر پر کوئی صلح کرا دوں۔"

پھر دلیش میں ہفتہ کے اختتام پر شیخ محمد عبداللہ جو کالی لمبی شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس تھے، ۳۰ کاروں کے کارواں کی قیادت کرتی جیپ پر کھڑے سڑک کے کنارے قطار اندر قطار ہجوم غفیر کو ہاتھ لہراتے جب اپنے پرانے دارالخلافہ سہری نگر میں پہنچے تو سہری نگر نے سہمے ہوئے "شور و غل" کے درمیان اپنے مایہ ناز سپوت کو خوش آمدید کہا۔ اور جب شیخ محمد عبداللہ مسلمانوں کی مقدس درگاہ کی بالکونی پر تشریف لائے تو لاکھوں کی تعداد میں کھڑے ہجوم نے چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ اور اُن کے سامنے وعدہ کیا۔ کہ وہ اُن کے لیے اپنی زندگیوں کو قربان کر دیں گے مگر شہر سے بہت دُور بخشی غلام محمد یہ کہہ رہا تھا کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور اس کی سیاسی حکمتِ عملی یہ کبھی برداشت نہیں کرے گی کہ کوئی فرد ہندوستانی یونین کی اس ریاستی سرحد پر ہمارے قانون کو چیلنج کرے اور نقضِ امن کا موجب بنے۔

ٹائم (امریکہ) ۲۵ جنوری ۵۸ء

نیویارک ٹائمز کی ۲۰ جنوری ۱۹۵۸ء کی رپورٹ کے مطابق

"۱۲ / جنوری کو کشمیر محاذ استصواب رائے عامہ نے اپنی تمام خدمات شیخ محمد عبداللہ کو سونپ دی ہیں۔ اور ان سے کہا ہے کہ محاذ ان کے ہر حکم کو تسلیم کرے گا، جسے شیخ عبداللہ بہتر سمجھتے ہیں۔"

"شیر کشمیر کی رہائی کے بعد تمام وادی میں ہندوستان کی حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے اور بقول سٹیفن ہاربر عام طور پہ یہ توقع کی جا رہی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شیخ عبداللہ کی رہائی سے فسادات کی آگ بھڑک اُٹھے۔ اس لیے خانہ جنگی کو روکنے کے لیے اُنھیں دوبارہ گرفتار کر لیا جائیگا۔"

(نیوز کرانیکل لنڈن ۸ جنوری ۱۹۵۸ء)

پھر گرفتاریاں

ابھی شیر کشمیر شیخ عبداللہ کو رہا ہوئے مشکل سے تین ہفتہ ہی گزرے تھے کہ حکومت نے ان کے رفقاء کار صوفی محمد اکبر اور خواجہ غلام محی الدین ہمدانی کو "کشمیر میں فسادات شروع کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔" اور گرفتاریوں کا سلسلہ سینکڑوں تک جا پہنچا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر شیر کشمیر نے پنڈت جواہر لعل کو لکھا۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں بھارت سرکار کی کشمیر سے متعلق پالیسی سے متفق نہیں ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اس دس سالہ طویل المدت مسئلہ کے خاتمے کا صرف ایک منصفانہ اور حقیقت پسندانہ راستہ ہے کہ کشمیری عوام کو حق خود ارادیت دے دیا جائے۔ جس کی خود آپ (نہرو) کئی بار پر جوش حمایت و تائید کر چکے ہیں

میں اپنے مسلک کی صداقت کا اب اتنا قائل ہو چکا ہوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب عالمی رائے عامہ کا ضمیر بھارت کو ہمارے مطالبات کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے گا۔ میں ریاست میں کسی حکومت کا خواہ اس کا چلن کیسا ہی کیوں نہ ہو، تختہ اُلٹ کر وہاں پر کسی قسم کی مصیبت پیدا کرنے کا خواہاں نہیں ہوں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس قضیے کے حل کی چابی آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ بخشی اور اس کے دیگر ساتھیوں کے فریب میں مبتلا ہو کر اس پالیسی پر کاربند نہ رہیں، جو آخر میں سب کی بدبختیوں اور تباہیوں کی موجب بنے گی۔"

(عبداللہ بنام نہرو ــــ ۱۱ر اپریل ۵۸ء)

مگر پنڈت نہرو نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے دستِ تعاون کو ٹھکرایا اور پھر انھیں اپریل ۵۸ء میں گرفتار کر کے جیل میں ٹھونس دیا اور ان کے خلاف دو بے بنیاد مقدمات بھی شروع کر دیے۔ جو آج بھی جموں کی عدالت میں چل رہے ہیں اس ساری جدّوجہد میں مرزا محمد افضل بیگ شیر کشمیر کے ساتھ رہے ہیں۔ ایسی شاندار رفاقت کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے وہ آج بھی اُن کے ہمراہ جیل کی چار دیواری میں ہیں مرزا افضل بیگ ۱۹۳۱ء سے تحریک آزادیٔ کشمیر میں شامل ہیں اور اس جدّوجہد میں آپ نے کئی بار جیل کی صعوبتیں برداشت کیں آپ علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہیں اور شیر کشمیر شیخ عبداللہ کے دستِ راست ہیں۔ تسلسل قید میں رہنے کے باعث آپ کی صحت گر چکی ہے۔ اور خود شیر کشمیر کی صحت کے بارے میں "چاند" نے لکھا ہے ـــ

"ان کے بال سفید ہو گئے۔ آنکھوں میں بینائی کم ہو گئی۔ اور کمر بھی جھک گئی ہے"

پردۂ لالہ و گُل

"کتابِ مقدس" میں مذکور ہے۔

"اے خداوند! میری دُعا سن۔ میری التجا پر کان لگا۔

اپنی وفاداری اور صداقت میں مجھے جواب دے۔

اور اپنے بندہ کو عدالت میں نہ بلا۔

کیونکہ تیری عدالت میں کوئی آدمی راستباز نہیں ٹھہر سکتا۔"

انسانی فطرت ہے کہ بعض اوقات انسان اعتراف میں لذّت محسوس کرتا ہے۔ اور اعتراف کا یہ اقدام اکثر وہی لوگ کرتے ہیں جو حقیقی معنوں میں اور بنیادی طور پر فراخدل اور وسیع القلب ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت شیخ محمد عبداللہ کی ہے۔ آج تک ان کے خلاف بے انتہا الزامات لگائے گئے ہیں۔ اس بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اب سنئے۔

"یہ کوشش درحقیقت ان تمام لوگوں کی خدمت کے مترادف بھی ہے جو اس مسئلہ کے حل نہ ہونے کی وجہ سے گذشتہ دس برس سے مہر بہ لب ہو کر کلفتوں اور مصائب سے دوچار رہیں۔ اور کون اس اٹل صداقت سے انکار کر سکتا ہے کہ اس قضیئے کے نہ نمٹنے کی وجہ سے نہ صرف جمّوں و کشمیر کے مسلمانوں کی تباہی و بربادی ہوئی ہے بلکہ اس مسئلہ کے کھٹائی میں پڑے رہنے کے کارن ریاست کی تمام آبادی بُری طرح مضطرب ہو چکی ہے۔"

حقیقی جمہوریت

اس لیے اس مسئلہ کا حل نہ صرف تمام ایشیا کے امن اور سالمیت کے لیے ممد و معاون ثابت ہوگا، بلکہ

یہ اُس کہنہ ناسور کو بھی بھر دے گا، جو ہندو پاک کے جسدوں کے اعضاء کو چاٹے جا رہا ہے۔ اور اب ہر باشعور انسان کے لیے یہ مقامِ فکر ہے کہ اس مسئلہ کو فرقہ پرستی سے توڑ مروڑ کر کے کیا اس کے حل میں کوئی مدد مل سکتی ہے۔

میرا یقین کامل ہے کہ سچے سیکولرزم میں جمہوریت کی حقیقی رُوح ہے، لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ اس جھگڑے کے حل کا یہ مطالبہ کہ جموں و کشمیر کے عوام کی خواہشات کا احترام کر کے الحاق کے معاملہ کو طے کیا جائے، سیکولرزم کے کس اصُول پر اس سے آنچ آتی ہے۔ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ مجھ پر "فرقہ پرستی" کا الزام تراشا گیا ہے۔ آج سے ۲۷ برس پیشتر بھی شمالی ہندوستان کی اخبارات کی اکثریت کئی بار مجھ پر یہ بہتان لگا چکی ہیں۔ اور مقامِ شکر ہے کہ ہر بار واقعات کی صداقتوں اور حقائق نے اِن لغویات کو غلط ثابت کیا۔ اور ایسے کئی مواقع ریاستی عوام کی جدّوجہد میں آئے۔

۱۹۳۱ء میں تو اخبارات نے یہاں تک لکھ دیا کہ میں "سُلطانِ کشمیر" بننے کا ارادہ کر چکا ہوں اور اس غرض کے لیے جامع مسجد سری نگر میں ایک "تاج" بھی تیار پڑا ہے، جو میرے سر پر رکھا جائے گا۔ آخر کار حق و صداقت کی فتح ہوئی اور قومی تحریک تمام ریاست کے گوشوں میں پھیل گئی۔ اس کے بعد یہی الزامات اُس وقت دُہرائے گئے جب "تحریکِ کشمیر چھوڑ دو" جاری کی گئی تھی۔ لیکن ان سب الزامات کی تردید کا موقع اُس وقت آیا، جب ۱۹۴۷ء میں ہمیں عملی امتحان میں سے گزرنا پڑا۔

اس وقت یہ الزامات نہ صرف بیہودہ اور غلط ثابت ہوئے بلکہ تمام دُنیا نے مسلمانانِ کشمیر کو ان کے اس عمل و کردار پر خراجِ تحسین ادا کیا، جو انھوں نے اپنے غیر مسلم

ہم وطنوں کی زندگیوں، جائیدادوں اور عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے سر انجام دیا۔ اور یہ برّ ِعظیم ہند و پاک میں قابلِ رشک مثال ہے۔ آج ۱۹۵۰ء میں وہی گروہ اور طبقہ پھر اپنے پُرانے اوچھے حربے استعمال کر رہا ہے اور مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ساتھ ان لوگوں کو بھی شریکِ کار بنا لیا ہے، جن کے ہاتھ ۱۹۴۷ء میں اپنے ہمسائیوں کے بے گناہ اور معصوم خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ اور جنھوں نے گاندھی جی کے قتل پر مسرّت و انبساط کا اظہار کر کے شادیانے بجائے اور مٹھائیاں تقسیم کیں۔ بہرحال مجھے یہ یقین ہے کہ مجھے ملوث کرنے کا یہ تازہ حربہ بھی ناکامی کی صورت میں ختم ہوگا اور میرے ہم وطن اب بھی مجھے اپنا ویسا ہی دوست، خیر خواہ اور بہترین ساتھی پائیں گے، جیسا کہ میں پیشتر ازیں تھا۔ میں آج بھی ان کے حقوق کا محافظ ہوں۔ اور میرے مستقبل کے طریقِ عمل کا ضامن میرے شاندار ماضی کا گرانمایہ ریکارڈ اس سلسلے میں کافی ہے۔ اس لیے میں اپنے ہموطنوں کے سامنے ان غلط الزامات کی صفائی میں کچھ کہہ کر نہ تو اپنا وقت ضائع کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں اس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔

جب خود غرض انسانوں کی پھیلائی ہوئی پروپیگنڈہ کی آندھی بیٹھ جائے گی، تب میرے ہم وطن اپنے ماضی کے ان تجربات کی روشنی میں جو اب تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، میرا تجزیہ کریں گے۔ اور اس ذلیل پروپیگنڈہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیں گے۔ حقیقی سیکولرزم درحقیقت دونوں فرقوں اقلیت اور اکثریت کے حقوق کی نگہداشت کا ضامن ہوا کرتا ہے اور میں نہایت مسرت اور فخر سے یہ کہتا ہوں کہ ریاست کی اکثریت نے کبھی بھی فرقہ پرستی کی آڑ لے کر اقلیّت کے حقوق کو پامال کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ امن کے تحفظ کے لیے مصائب برداشت کیے۔ اور مجھے

یقین اور امید ہے کہ ریاست کی اقلیت نے بھی فرقہ پرستی کی روشنی میں اکثریت کے فرقہ کو جائز حقوق کے تحفظ سے نہیں روکا۔"

دوسرا رُخ یہ تو تھی اندرونِ مقبوضہ کشمیر، شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی بھارت کے خلاف صدائے احتجاج کی کہانی، جو آج بھی جاری ہے، اور اس وقت تک جاری رہے گی، جب تک نہرو کی حکومت ان کے مطالبہ آزادی کو تسلیم نہیں کر لیتی۔ اس کے برعکس پاکستان میں سیاسی لیڈروں نے کیا کچھ کیا، وہ سب کے سامنے ہے۔ پاکستان نے ۱۹۵۵ء میں "آل پارٹیز کانفرنس" منعقد کی، اس میں چند قراردادیں پاس ہوئیں۔ جن کا مفہوم یہ تھا کہ جب تک کشمیر آزاد نہیں ہوگا، پاکستان چین سے نہیں بیٹھے گا اور یہ حقیقت ہے کہ پاکستان نے اخلاقی طور پر کشمیریوں کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ اور اگر وہ اپنی داخلی مشکلات کا شکار نہ ہوتا تو یقیناً جنگ میں بھی کود پڑتا۔ مگر پے درپے سیاسی بحرانوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ اب موجودہ حکومت سے یہ توقع ہے کہ اس مسئلہ کے لیے ٹھوس اقدامات کرے گی کیونکہ آزاد کشمیر میں جو آئینی تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ کسی آنے والے انقلاب کی دلیل ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان کی سب جماعتیں اور لیڈر متفق ہیں اور حکومتِ پاکستان کی پالیسی کے ہمنوا ہیں۔

جون ۱۹۵۸ء میں چودھری غلام عباس اور مسٹر کے ایچ خورشید نے "تحریک آزادیٔ کشمیر" جاری کی جس کا مقصد حدِ متارکہ کو توڑ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونا تھا۔ یہ تحریک تمام پاکستان اور آزاد کشمیر میں ہر دلعزیز ہوئی اور بیشتر لوگ اور کشمیر کے کئی صفِ اوّل کے لیڈر مثلاً مسٹر اے۔ آر ساغر۔ سردار عبدالقیوم خان، راجہ حیدر خان،

یوسف صراف اور شیخ غلام قادر اس میں شامل ہو کر پابندِ سلاسل ہوئے۔ اس تحریک میں قاضی خورشید عالم نے بہت حصّہ لیا۔ اور یہ تحریک اُس وقت ختم ہوئی جب مارشل لا نافذ ہوا۔

اب آزاد کشمیر حکومت نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ خود اہلِ وطن جہاد شروع کریں۔ اگر پاکستان اس جنگ میں کودا تو بھارت کشمیر کے مسئلہ کو پاکستان سے جوڑ کر اس کی سرحدوں پر اپنی افواج جمع کر دے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خود کشمیری اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے پھر آگے بڑھیں اور اندرونِ وطن جس تحریک کو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے جاری کر رکھا ہے اُس کو تقویت اور مدد پہنچائیں۔

آزادئ کشمیر کی اس جدوجہد کے لیے ضروری ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں کو پھر نہ دہرائیں اور اُن لیڈروں کے دھوکے میں نہ آئیں جنھوں نے ۳۴ سال تک کشمیری عوام کو فریب دیے اور ان کے نام پر لوٹ کھسوٹ کی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک نئے جوش اور نئے ولولے کے ساتھ اُن لوگوں کے ساتھ چلیں۔ جو دیانت دار بھی ہیں اور محبِ الوطن بھی اور جن کے دامن سیاسی آلودگیوں سے پاک اور دل قومی درد سے پُر ہیں اور سب سے بڑھ کر جو برملا کہہ رہے ہیں ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دُھندلی سی اِک تصویر دیکھ

کیونکہ ان کو یہ احساس ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کا حل۔ عوام کی اجتماعی قوت ہی میں مضمر ہے۔

شخصی حالات

شخصی حالات

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ ریاست جموّں وکشمیر کے اُن چند لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھیں خدا تعالیٰ نے علم وعمل اور تقریر وتحریر کی صلاحیتیں بھی ودیعت فرمائی ہیں اور اسلامی فضائل حمیدہ سے بھی نوازا ہے۔ وہ ادب وشعر کا ذوق بھی رکھتے ہیں، اور طبیعت میں سوز وگداز بھی ہے۔

ادیب اور ادب نواز

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ پوری ریاست میں شیخ محمد عبداللہ کے مقابلے کا کوئی مقرر نہیں اُن کی تقریر میں روانی اور سلاست بھی ہوتی ہے، اور برمحل اور باموقع الفاظ اور فقروں کے استعمال پر بھی اُنھیں بڑی قدرت ہے کشمیری زبان کے علاوہ آپ اردو اور انگریزی میں بھی بڑی اچھی تقریر کرتے ہیں۔ آپ عموماً اردو میں تقریر کرتے ہیں۔ اگر کسی غیر ملکی اجتماع یا وفد کے سامنے مافی الضمیر بیان کرنا ہو، تو پھر انگریزی میں بولتے ہیں آپ کی تحریر وتقریر کی سب سے نمایاں خوبی حق گوئی ہے۔ وہ حق بات کہنے میں بالکل

نہیں جھجکتے، اور بڑی جرأت سے کام لیتے ہیں۔ تقریر شروع کرنے سے پہلے قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے ہیں پھر تلاوت کی ہوئی آیات کا ترجمہ کرتے ہیں، اکثر ایسا ہوا، کہ شیخ محمد عبداللہ تقریر کر رہے ہیں، اور ہزاروں کا مجمع ہے کہ وہ رو رہا ہے لوگ اُن کی تقریروں سے اتنے متاثر ہوتے ہیں، اور اُن پر پروانہ وار نثار ہونے کے لیے ٹوٹے پڑتے ہیں۔

تقریر کے ساتھ ساتھ شیرِ کشمیر تحریر میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے ہیں آپ نے مسئلہ کشمیر پر متعدد پمفلٹ لکھے ہیں۔ آپ کے خطبات اور خطوط، نیشنل کانفرنس کا دستور العمل، "کشمیر چھوڑ دو" کی یادداشت، سلامتی کونسل کے نام خط، اور نہرو کے نام خطوط آپ کے ملکۂ تحریر کا بہترین نمونہ ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری بھی لکھی ہے جس کے اقتباسات اس کتاب میں درج ہیں، کشمیر جیسے یاس و غم بھرے ماحول میں رہنے کے باوجود ان کے دل میں کتنی امنگ اور جوش و ولولہ ہے، اس کا اظہار اُن کی تحریروں میں ہوتا ہے اور وہ اُن کی عظمت کا پتہ دیتی ہیں آپ کو شاعری سے لگاؤ ہے کشمیر میں آپ نے بہت مشاعرے منعقد کرائے۔ اور باہر سے شعراء کرام اور ادباء کو کشمیر آنے کی دعوتیں دیں۔ شاعرِ اسلام حفیظ جالندھری نے "تصویرِ کشمیر" —— اور "چراغ لالہ" ایسی معرکۃ الآرا نظمیں انہیں کے کہنے پر کہیں اور اس طرح ممتاز صحافی مولانا چراغ حسن حسرت نے بھی ان کے ایما پر "کشمیر" لکھی۔ غرضیکہ جو کوئی بھی صاحبِ علم یا صحافی کشمیر میں آیا، شیخ عبداللہ کی سخن فہمی اور ادب پرستی اُس کے لیے جاذبِ توجہ بنی، پنڈت پریم ناتھ بزاز نے "کشمیر کا گاندھی" اور میر محمد نیاز نے "شیرِ کشمیر" میں ان بطلِ حریت کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

آپ کو صحافت سے گہرا لگاؤ ہے۔ آپ نے سب سے پہلے پنڈت پریم ناتھ

بزازسے مل کر سری نگر سے اخبار "ہمدرد" جاری کیا۔ اس کے بعد وہ "خدمت" کی سرپرستی کرتے رہے آپ نے "ہمدرد" میں کشمیر کی سیاسی حالت پر بہت کچھ لکھا اور غیر ملکی اخبارات میں سینکڑوں مضامین مہاراجہ کے تشدد کے خلاف سپرد قلم کیے۔

قرآن سے عشق

شیخ محمد عبداللہ کو قرآن حکیم سے عشق ہے۔ سارا قرآن حکیم آپ نے حفظ کیا ہوا ہے۔ جب کبھی آپ قرآن کریم کا ذکر کرتے ہیں تو بے اختیار آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، عوامی اجتماعوں میں قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے بعد آپ تلاوت کی ہوئی آیات کا ترجمہ کرتے اور اُن کا مفہوم حاضرین کو سمجھاتے ہیں۔ جیل میں جو چیز سب سے پہلے آپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، وہ قرآن کریم ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب نے اُن کو غیر معمولی عزم، قوت اور جرأت بخشی ہے۔ آپ نہایت باقاعدگی سے نماز پڑھتے اور ماہِ رمضان میں روزے رکھتے ہیں۔ آپ جب سری نگر میں موجود ہوں تو جمعہ کی نماز پتھر مسجد یا حضرت بل کی درگاہ میں پڑھتے ہیں۔ شیخ عبداللہ ہی کی کوششوں سے حضرت بل کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ اور اس درگاہ کی ایک شایانِ شان عمارت بن گئی۔ بابِ رحمۃ اللعالمین، بابِ نسیم آج بھی شیخ کی انہی کوششوں کی یاد دلاتے ہیں۔

آپ کو علماء کرام سے بڑی محبت وعقیدت ہے۔ کشمیر کے مذہبی پیشواؤں سے (سیاسی نظریات سے قطع نظر) وہ بڑی عقیدت رکھتے ہیں، خصوصاً میر واعظ ہمدانی سے ان کے تعلقات بڑے اچھے رہے ہے۔ آپ نے علماء کرام کو اعتماد میں لے کر ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے خطبات میں عوام کے مسائل اور ان کی تکلیفوں کا ذکر کیا کریں۔

ایک صالح مسلمان ہوتے ہوئے آپ نے اپنے ہم وطن غیر مسلموں کی کبھی بھی دلشکنی نہیں کی۔ بلکہ ان کی حفاظت کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہے۔ آپ نے ہندوؤں اور سکھّوں کے مذہبی اداروں پر کبھی تنقید نہیں کی۔ جب شرنارتھیوں نے گوردواروں اور مندروں میں پناہ لی تو آپ روزانہ ان کے پاس جاتے اور ان کو سہولتیں بہم پہنچاتے۔

سب کے دوست اور ساتھی

آپ کا حلقۂ احباب بڑا وسیع ہے، اور ہر طبقے کے لوگوں سے ہمیشہ آپ کے تعلقات رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں ادیب، صحافی، پروفیسر، انجنیئر، ڈاکٹر اور بڑے بڑے کاروباری لوگ اُن کی دوستی کا دم بھرتے، وہاں ان کے خاص احباب میں لاریوں کے ڈرائیور، کشتیوں کے ملاّح، مِلوں کے مزدور اور دفتروں کے ملازمین بھی ہیں اور سب کو یہ فخر ہے کہ شیرِ کشمیر ان کے دوست ہیں۔

تعلیم کی نشر و اشاعت سے شیخ عبداللہ کو بڑا شغف ہے اس غرض کے لیے آپ نے تحریک کے دوران ہی میں ہر جگہ چندے جمع کرائے سکول کھلوائے۔ درس گاہیں بنوائیں اور مفت تعلیم کو عام کرنے کے لیے جدّ و جہد کی۔ انھوں نے بچوں کو باقاعدگی سے تعلیم دلوانے کی تلقین بھی کی اور ان کے لیے ذرائع بھی مہیا کیے۔ کشمیر کے سینکڑوں طالب علم ان کی کوششوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی ان ہی کی کوششوں کی مرہونِ منّت ہے۔

جب ۱۹۳۱ء میں شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموّں و کشمیر کی آزادی کی جدّوجہد شروع کی، تو کشمیر کی عورتوں نے بھی آواز پر لبیک کہا۔ اُن کی گرفتاری پر جب سری نگر

میں خواتین نے جلوس نکالا تو مائیسمہ بازار میں ڈوگرہ فوجیوں نے اس جلوس پر حملہ کیا جس میں کئی خواتین شہید اور بہت سی زخمی ہوئیں۔ اسی طرح تحریک "کشمیر چھوڑ دو" میں اور اس کے بعد ہر تحریک میں وادی کشمیر کی عورتوں نے حصہ لیا ہے اور ان کو شیر کشمیر کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ خواتین گھر گھر جاکر چندہ جمع کرتیں، اور تحریک کا سارا کام درپردہ اس طرح ہو جاتا۔ نیشنل کانفرنس میں عورتوں کو بھی نمائندگی حاصل تھی۔

شیر کشمیر شروع سے مزدوروں کے بہی خواہ رہے ہیں۔ بسا اوقات اُنھوں نے مزدوروں کی حمایت میں اُن کے مالکوں سے ٹکر لی۔ اور مزدوروں پر ظلم ہوتے نہ دیکھ سکے اور مالکوں کی سرکوبی کر دی۔ انھوں نے مزدوروں کے حقوق کی نگہداشت کی اور اُنھیں مراعات دلائیں۔ جب آپ وزیر اعظم ہوئے تو آپ نے زرعی اصلاحات کے ذریعہ جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔ اور کسانوں، مزارعوں اور مزدوروں کی دادرسی کی۔

عرصۂ اسیری شیر کشمیر پہلی بار اس وقت گرفتار ہوئے، جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے، بعد ازاں جب اُنھوں نے سیاست کے پُرخار میدان میں قدم رکھا تو قید گویا ان کے روزمرّہ معمول میں داخل ہوگئی۔ آپ متعدد بار گرفتار ہوئے ہیں۔ کئی بار حکم زبان بندی ملا اور کئی بار نظربند کیے گئے۔ بحیثیت مجموعی اس وقت آپ کی اسیری کا عرصہ ۲۱ سال، ۷ ماہ بنتا ہے اور یہ قید اب تک جاری ہے اور نہ جانے کب تک یہ سلسلۂ دار و رسن جاری رہے ؎

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اخلاق و عادات شیر کشمیر اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ اور نہایت

سادہ دل انسان ہیں۔ ان کا دل صاف اور دماغ روشن ہے۔ شیر کشمیر منافق آدمی کے سخت خلاف ہیں۔ اور مصلحت کیشی کو سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں اور ڈپلومیسی کے قائل نہیں۔ وہ سیدھی اور صاف سیاست پر کاربند ہیں۔ اور یہی اُن کی زندگی کا اصول رہا ہے۔

آپ نہایت خوش پوش انسان ہیں۔ لباس عموماً شیروانی یا لمبا کوٹ پائجامہ اور سر پر جناح کیپ پہنتے ہیں۔ یا کبھی کبھی شال لیتے ہیں۔ جنگ کے دوران پاکستان کے جو لوگ کشمیر رہ گئے، اُن کے ساتھ نہایت حُسن سلوک سے پیش آئے اور جنگ کے باوجود ان کو پاکستان جانے کی سہولتیں فراہم کیں۔

آپ کی ذاتی جائیداد کوئی نہیں ہے۔ البتہ بیگم شیخ عبداللہ کی کافی جائیداد ہے، جو اُن کو اپنے والد سے ملی ہے۔ اب بھارت حکومت نے ان کی ساری جائیداد ضبط کر رکھی ہے۔

شیخ عبداللہ کی بیگم ایک انگریز کی بیٹی ہیں۔ جس کا سری نگر اور ہندوستان میں وسیع کاروبار تھا اور جن کی اہلیہ کشمیری نژاد تھیں۔ بیگم عبداللہ ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ خاتون ہیں اور اسلامی تعلیمات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ آپ ابتدا ہی سے پاکستان کی حامی تھیں۔ آپ نے شیخ محمد عبداللہ کو ہر سیاسی موڑ پر مشورے دیئے ہیں آج بھی جو مقدمہ شیخ محمد عبداللہ پر چل رہا ہے اس میں بھارت کا یہ موقف ہے کہ اس سازش میں بیگم عبداللہ شریک تھیں اور یہ سب کچھ بیگم عبداللہ کے ایما اور کوشش سے ہوا ہے۔

شیر کشمیر کے تین بیٹے اور ایک لڑکی ہے۔ بڑے بیٹے کا نام فاروق عبداللہ۔

منجھلے کا طارق عبداللہ اور چھوٹے کا مصطفیٰ عبداللہ ہے۔ فاروق عبداللہ تو کئی بار جیل جا چکے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۲۸ برس ہے۔ طارق عبداللہ ریاست بدر ہیں اور مصطفیٰ عبداللہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لڑکی شادی شدہ ہے، اور اُن کا خاوند بھی پابندِ سلاسل ہے۔

یہ ہے اُس مردِ حُر کی شخصی زندگی۔ اور ان کی سیاسی زندگی بھی آپ کے سامنے ہے۔ اَب آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ شیخ محمد عبداللہ نے اس "عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے"۔

ایک تاریخی تقریر کا مسوّدہ

شیخ محمد عبداللہ ۲۱ راگست ۱۹۵۳ء کو عیدالاضحیٰ کی مبارک تقریب پر یہ تقریر کرنا چاہتے تھے جس کا مسوّدہ اشاعت کے اُنھوں نے دہلی بھجوایا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ تقریر کرتے بھارتی حکومت نے ۹ راگست ۱۹۵۳ء کو اُنھیں ریاست کی وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا اور اس طرح یہ تقریر کی نہ جا سکی:۔

"کچھ عرصہ سے ہندوستان میں ہمارے دوست کشمیر کے حالات و واقعات کی صحیح شکل و صورت جاننے کے خواہشمند رہے ہیں۔ میں نے اپنی حالیہ تقریروں میں ان واقعات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بدقسمتی سے جب میں نے اُن امور کی طرف اہلِ ملک کی توجہ مرکوز کرنے اور ریاست کے اندر کی صورتِ حال کا ایک واضح اور پرخلوص تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی، تو اس کو غلط طریقہ سے سمجھا گیا۔ میرے تجربہ میں یہ بات آئی کہ اس سلسلے میں ہندوستان کو اپنے اعتماد میں لینے اور عوام کو حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے میں نے جو کوششیں

کیں، اُن کے نتائج برعکس نکلے ہیں۔

میں اس حقیقت سے باخبر ہوں کہ ہندوستان کے لاکھوں لوگ جذبات اور میل جول کی بنا پر کشمیر سے وابستہ ہیں۔ گذشتہ پانچ سال میں ہمیں مشترکہ مقاصد کے لیے جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور جو قربانیاں دینا پڑیں، اُنھوں نے ہمیں ایک دوسرے سے قریب تر کیا ہے۔ بنا بریں اِن حالات میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ ہندوستان کے لاکھوں لوگوں کو کشمیر کے واقعات سے گہری دلچسپی ہے۔ وہ کیوں ہے۔ اگر حالات یہاں کوئی غلط راستہ اختیار کرتے ہیں، تو وہ وہاں گھبراہٹ اور پریشانی محسوس کرتے ہیں یہ ایک بدقسمتی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے شاذ و نادر ہی یہاں کے واقعات و حالات صحیح اور واضح طریقہ پر پیش کیے جاتے ہیں اور جو کچھ اُن کے سامنے رکھّا جاتا ہے، اس سے یا تو اُن کی طفل تسلّی مقصود ہوتی ہے یا اُن کے جذبات کو مشتعل کیا جاتا ہے۔

غیر یقینی حالات

میں کوشش کروں گا کہ کشمیر کی صورتِ حال کا ایک واضح نقشہ آپ کے سامنے رکھ دوں۔ اس سلسلے میں پہلے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کے لیے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کا مستقبل متعیّن کرانے کے لیے پانچ سال سے زیادہ عرصہ انتظار کے بعد ریاست جمّوں و کشمیر کے عوام اب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے لیے موجودہ تعطّل اور غیر یقینی حالت میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ تعطّل اور غیر یقینی حالت عوام کے دل و دماغ اور

اعصاب پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ کاروبارِ حکومت کے ہر پہلو پر اس کا اثر پڑا ہے لوگوں کے اقتصادی معیار اونچا کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں اس بڑھتی ہوئی غیر یقینی حالت نے تقریباً ان سب کو بے حقیقت بنا ڈالا ہے۔ سرکاری کام کا معیار گھٹ گیا ہے۔ کیونکہ سرکاری ملازم اقتدار پسند اور مفادِ خصوصی رکھنے والے مخالف گروپوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ منصوبہ بندی مشکل ہو جاتی ہے اور قومی تعمیر کے اُن مختلف منصوبوں کو عملی شکل دینا تاخیر میں پڑ جاتا ہے۔ جن کو اب آخری کُلّی تصفیہ تک انتظار میں رکھا جانا ضروری ہے۔ اس غیر یقینی حالت نے لُوٹ کھسوٹ اور رشوت خوری کو بڑھا دیا ہے اور بے اصول اور خود غرض لوگ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ساتھ ہی اس غیر یقینی کیفیّت نے عوام کو اقتصادی طور پر کمزور کر ڈالا ہے۔ کیونکہ آمدن کے پُرانے ذرائع ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

عارضی الحاق سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاست نے ہند کے ساتھ الحاق کر لیا ہے تو لوگ اپنے مستقبل کے متعلق اس غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار کیوں ہیں اور اس الحاق کو آئین ساز اسمبلی میں رائے اندوزی کے ذریعہ مستقبل کیوں نہیں بنایا جاتا۔ اس سوال کا پوچھنا جواب کے مقابلہ میں آسان ہے اور جو لوگ ایسا سوال کرتے ہیں۔ وہ پُر خلوص ہیں اور اُن کے ارادے نیک ہیں بدقسمتی سے جب ہم ایک مشکل مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں، تو ہم اس سوال کی بنیادی مشکلات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کشمیر اور ہندوستان کا باہمی الحاق اگرچہ باقی تمام پہلوؤں سے مکمّل ہے۔

لیکن اس کے اندر ایک کمزوری ہے۔ یہ ایک ایسا الحاق ہے جو عارضی تسلیم کیا گیا ہے اور بعد میں جس کی تصدیق عوام کو کرنی ہے۔ بنابریں اس میں قطعیّت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ الحاق بجائے خود کافی حد تک موجودہ غیر یقینی حالت کا موجب بن چکا ہے۔

فریقِ ثانی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان ایک ایسے فریق کی حیثیت حاصل کر چکا ہے، جس کو اس مسئلے کے ساتھ براہِ راست واسطہ ہے۔ ان حالات میں جب ہم اس غیر یقینی حالت کا خاتمہ کرنے کے لیے مسئلہ الحاق کا فوری حل چاہتے ہیں، تو ہمیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا چاہیے۔ ویسے بھی یہ مسئلہ کچھ کم پیچیدہ نہ تھا لیکن اس حقیقت نے کہ یہ مسئلہ ایک بین الاقوامی جھگڑے کے طور پر سکیورٹی کونسل کے ایجنڈا میں بحث و نزاع کا ایک محبوب مشغلہ بنا ہوا ہے اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس پر بحث کی جاتی ہے، اس کی پیچیدگیوں میں اور اضافہ کر دیا ہے۔

کشمیر کی آئین ساز اسمبلی اب یہاں یہ تجویز بھی ہے کہ ہند اور کشمیر کے الحاق کو آئین ساز اسمبلی میں رائے اندوزی کے ذریعہ آخری شکل دلائی جائے۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا ہندوستان، پاکستان اور انجمن اقوامِ عالم آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کی پابند ہیں؟ حکومتِ ہند جو اس جھگڑے میں فریقِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، وہ بھی اپنے آپ کو آئین ساز اسمبلی کے کسی ایسے فیصلے کا پابند تصوّر نہیں کرتی، جس کا تعلق الحاق کے مسئلہ کے ساتھ ہو۔ چنانچہ انڈین ڈیلیگیشن کے لیڈر کی حیثیت سے سکیورٹی کونسل

کے سامنے شری بی۔ این۔ راؤ نے جو بیانات دیے، ان کے اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ شری بی۔ این۔ راؤ نے مارچ ۱۹۵۱ء میں فرمایا تھا:—

"میں اس مسئلے پر بحث کروں گا، جو سکیورٹی کونسل کے بعض ممبروں کے لیے تشویش کا موجب ہو چکا ہے اور وہ ہے کشمیر کے لیے آئین ساز اسمبلی بلانے کی تجویز۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کشمیر اس وقت وفاقِ ہند کا ایک حصّہ ہے اور اسی بنا پر یہاں نظامِ حکومت چلنا چاہیے۔ جب ہم ہندوستان کے لیے ایک دستور تیار کر رہے تھے، تو ہمیں اس بات پر غور کرنا پڑا کہ وفاقِ ہند کی مختلف وحدتوں کے دستور کے لیے کونسی قانونی دفعات رکھی جانی چاہئیں۔ اس غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ ہوا تھا کہ اس دستور کی تشکیل متعلقہ وحدت کی آئین ساز اسمبلی کو سونپا جانا چاہیے۔ اس فیصلہ کے مطابق کئی وحدتوں نے آئین ساز اسمبلیاں قائم کیں، جن میں سوراشٹر، ٹراونکور، کوچین اور میسور بھی شامل ہیں۔ دوسری کسی نہ کسی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہیں۔ کشمیر انہی میں سے ایک ہے، جہاں آئین ساز اسمبلی کا قیام ابھی تک عمل میں لایا نہیں گیا ہے اور اسی لیے اس ریاست کا دستور ابھی بنانا ہے۔ آنریبل ممبروں کو اس بات کا خیال رہنا چاہیے کہ آئین ساز اسمبلی بلانے کی تجویز صرف کشمیر کے لیے ہی نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ تجویز وفاقِ ہند کے دوسری ایسی ہی وحدتوں کے لیے بھی تھی۔ یہ امر شک و شبہ

سے بالاتر ہے کہ آئین ساز اسمبلی کو دنیا کے اکثر حصّوں میں دستور بنانے والی مشینری تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ دستورِ ہند میں آئین ساز اسمبلی کے لیے قانونی طور پر گنجائش رکھی گئی، جو کشمیر کے کانسٹی ٹیوشن کی تفصیلات طے کرے۔ کیا یہ اسمبلی الحاق کے مسئلہ پر فیصلہ دے گی۔ میری حکومت کا نقطۂ نظر اس سلسلے میں یہ ہے کہ یہ آئین ساز اسمبلی اگر چاہے تو اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کرے لیکن اس مسئلے پر وہ اپنا کوئی فیصلہ نہیں دے سکتی۔" (۱۲ مارچ ۱۹۵۱ء)

ایک اور اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے شری راؤ نے یوں فرمایا:-

"یہ مجھے آئین ساز اسمبلی کے موضوع کی طرف رہنمائی کر رہا ہے، جو بظاہر کونسل کے بعض ممبروں کی پریشانی کا موجب ہوتا آیا ہے۔ میں نے اس موضوع پر پہلے ہی اپنی حکومت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے۔ ایک وفاق کے اندر بھی ہر سٹیٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دائرہ عمل میں اپنا آئین بنائے اور اس غرض کے لیے ایک خاص جماعت مقرر کرے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے اندر ہر سٹیٹ کا آئین، جو اس وقت نافذ العمل ہے، اسی طریقہ پر بنایا گیا تھا۔ بنابریں ہندوستان کشمیر کو، جو انڈین فیڈریشن کا ایک حصّہ ہے، یہ حق استعمال کرنے سے روک نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ حق غیر مبہم اور واضح طور پر دستورِ ہند میں تسلیم کیا گیا ہے۔ کونسل کے بعض ممبروں کو یہ خطرہ دامنگیر ہو چکا ہے کہ کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کہیں اسی کارروائی کے دوران میں مسئلہ الحاق

پر کوئی رائے ظاہر نہ کرے۔ کشمیر آئین ساز اسمبلی اگر چاہے، تو اس کو طبعی طور اس مسئلے پر رائے ظاہر کرنے سے روکا نہیں جا سکتا لیکن اس قسم کی رائے نہ تو حکومتِ ہند کو پابند بنا سکتی ہے اور نہ ہی کونسل کی پوزیشن پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ میں نے حکومتِ ہند کے نمائندہ کی حیثیت میں یہ پہلے بھی کہا ہے اور اس پر اظہارِ افسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا کہ میں نے اپنی حکومت کی طرف سے جو بیانات دیئے اُن کے باوجود اُسے معرضِ بحث میں لایا گیا۔"

(۲۹ مارچ ۱۹۵۱ء)

ایک اور واقعہ، جس کا ذکر یہاں ضروری ہے کہ ریاست کا تقریباً ایک تہائی حصہ آئین ساز اسمبلی میں کوئی نمائندگی نہیں رکھتا۔ کیا ان حالات میں آئین ساز اسمبلی کا فیصلہ قضیۂ کشمیر کو حل کر سکے گا اور موجودہ غیر یقینی حالات کا خاتمہ کر سکے گا۔ میرا جواب ہے کہ نہیں۔

معاہدۂ دہلی

میرا خیال ہے کہ میں یہاں معاہدۂ دہلی کا بھی ذکر کروں ان معاہدات کو ہند پارلیمنٹ اور ریاست کی آئین ساز اسمبلی دونوں نے تسلیم کیا تھا اور ہم اس کا اقرار کر چکے ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا اس معاہدے کی تکمیل کسی صورت میں ریاستی عوام کے اس مطالبے کو پورا کر سکتی ہے کہ موجودہ غیر یقینی صورتِ حال کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ان معاہدات کے ذریعہ کوشش کی گئی ہے کہ بعض معاملات میں ہندوستان کے اندر کشمیر کی حیثیت کا واضح تعیّن ہو جائے۔ فرض کر لیجئے

کہ آئین ان معاملات میں موزوں گنجائش رکھے گا اور یہ معاملات واضح طور پر آئین میں شامل بھی کیے جائیں گے ۔ کیا اس سے بنیادی رشتے یعنی الحاق کا مسئلہ طے ہو جائے گا؟ اگر یہ رشتہ عوام کی تصدیق کے تابع اور عارضی ہے، تو معاہدۂ دہلی کی نوعیت بھی عبوری اور عارضی ہوگی۔ اس لیے یہ معاہدہ ریاست کے مستقبل کے متعلق مشکل سے ہی کچھ کر سکتا ہے۔ ان حالات میں تعطّل اور غیر یقینی صورتِ حال جاری ہے اور لوگ پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہیں۔

پاک ہند مصالحت کا اثر خوش قسمتی سے کچھ عرصہ سے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں نمایاں طور پر بہتری کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ جموں و کشمیر کے عوام کے دل ہند اور پاکستان کے وزرائے اعظم کی کراچی میں حالیہ ملاقات کے موقع پر مسرّت اور امید سے بھر گئے۔ ریاست کے عوام روز بروز محسوس کر رہے ہیں کہ مسئلے کا جائزہ لیتے وقت ریاست کے عوام کے مجموعی فائدے کو زیرِ نظر رکھیں۔

سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی روابط ریاست جموں و کشمیر کی جغرافیائی پوزیشن اس قسم کی کہ اس کی خوشحالی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس کی تجارت دونوں ملکوں کے ساتھ آزادانہ طور پر رہے ۔ ریاست کے اندر ایسے نسلی اور کلچرل گروہ موجود ہیں، جو ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف ہیں اور جو مغربی پنجاب

صوبہ سرحد اور مشرقی پنجاب کے پڑوسیوں کے ساتھ گہرے تعلقات اور مراسم رکھتے ہیں۔ انہی متضاد اور متخالف حالات نے وادی اور اس کے بعض ساتھ والے حصّوں کو گھیرا ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ہی کشمیر کے دریا اور شاہراہیں پاکستان کی طرف جاتی ہیں۔ ہماری موجودہ ایک ہی شاہراہ جو ہمیں ہندوستان سے ملاتی ہے سال بھر میں تقریباً تین ماہ بند رہتی ہے۔ کشمیر اپنی ضروریات کی چیزیں مغربی پنجاب سے برآمد کرتا رہا ہے۔ کشمیر کا نزدیک ترین ریلوے سٹیشن راولپنڈی میں تھا اور وادی کے تاجر اپنے غیر ملکی مال کی برآمد کے لیے کراچی کی بندرگاہ استعمال کرتے تھے۔

پرجا پریشد

اس سلسلے میں پرجا پریشد کی ایجی ٹیشن اور ہندوستان میں ان کی تائید میں چلائی ہوئی تحریک کا ذکر کرنا ضروری ہے اس تنظیم کے لیڈروں نے جموں میں ۱۹۴۷ء کے افسوسناک حالات میں بڑا حصّہ لیا۔ بعد میں یہ لوگ ہندوستان کے حامی بن کر نمودار ہوئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ مکمل طور پر مدغم کرنا چاہیئے۔ گذشتہ سال دسمبر کے مہینے میں انھوں نے ایک زبردست ایجی ٹیشن اٹھائی جس میں وہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ اس کا ردِ عمل فوری طور پر کشمیر اور عام مسلمانوں میں پیدا ہو گیا۔ ایجی ٹیشن پوری طاقت سے چلائی گئی اور اسے ہندوستان سے اخلاقی اور مالی امداد دی جاتی رہی۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب معاہدہ دہلی مرتب ہوا تھا جس کی رُو سے

ہندوستان کے آئین میں کشمیر کے لیے ایک مخصوص حیثیت منظور کی گئی تھی پاکستان ریڈیو اور پریس نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ ایجی ٹیشن کے علاوہ بعض ہندوستانی لیڈروں کے بیانات کا حوالہ بھی دیا گیا جن سے مسلمانوں کے جذبات میں طلاطم آ گیا۔ ان بیانات میں کہا گیا تھا کہ اگر کشمیر کے مسلمان ہندوستان کے آئین کو کاملاً تسلیم نہیں کرتے، تو انہیں ہندوستان کی حدود یعنی جموں و کشمیر میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ پرجا پرشید کا مسلم کُش اور سماج دشمن ماضی اس کی حال کی ہندوستان دوستی اور ہندوستان کے آئین اور جھنڈے سے محبت کے دعویٰ کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ پرجا پرشید کو ریاست سے باہر جو تائید ملی اور وہ استقبال، جو پرجا پرشید کے لیڈروں کو ہندوستان میں دیا گیا، یہ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے کشمیر کے عام مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ کہیں پرجا پرشید اور ہندوستانی آئین ایک دوسرے کے مداح تو نہیں اور کیا وہ ان وعدوں اور یقین دہانیوں پر اعتماد کر سکتے ہیں جن کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی لیکن اُن کی اگر منسوخی نہیں تو جبری ترمیم کا خطرہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ مدغم کرنے کے سلسلے میں ایجی ٹیشن کرنے کا ایک اور اثر ہوا۔ وہ یہ کہ اُس نے مسلمانوں کے اندر ہماری پوزیشن کمزور کر دی اور نیشنل کانفرنس نے مسلمانوں کو ہندوستان کی حمایت کرنے پر آمادہ کرنے کی گذشتہ چند سال سے جو کوششیں کی تھیں، اُن پر قریباً پانی پھیر دیا۔ اس سلسلے میں نہ صرف میری اپیلیں بلکہ خود وزیرِ اعظم ہندوستان کی اپیلیں

بھی بے سود گئیں۔

مُسلم اکثریّت کا فیصلہ

اگرچہ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں تاہم میں نے اس بات کا بار بار تذکرہ کیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ ریاست کے مسلمانوں کو کرنا ہے، غیر مسلموں کو نہیں کیونکہ غیر مسلموں کی پاکستان میں کوئی جگہ نہیں اور وہ ہندوستان کے سوا کسی اور امکان پر سوچ بھی نہیں سکتے۔ مجھے ہر ہندو اور سکھ کو یقین نہیں دلانا ہے کہ اس کا مستقبل ہندوستان میں محفوظ ہے کیونکہ ایسا کرنا غیر ضروری ہے بلکہ مجھے یہاں کے مسلمانوں کو، جو اکثریّت میں ہیں، مطمئن کرنا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے غلط سمجھا گیا۔ میرے متعلق ان لوگوں کو بھی غلط فہمی ہوئی ہے، جو صدق دلی اور خلوص سے کشمیر کو ہندوستان کا ایک حصّہ بنانا چاہتے ہیں۔ مجھے ایسے مواقع یاد ہیں جب میں نے مسلمانوں کے جائز حقوق دلانے کی کوشش کی یا مستقبل کے متعلّق مسلمانوں کے خیالات ظاہر کیے، تو مجھے میری دوستوں نے فرقہ پرست اور نمک حرام کہا۔

کشمیری مسلمانوں کا مستقبل

وہ لوگ جن باتوں کی مجھ سے توقع رکھتے ہیں، اس سے سمجھنا مشکل ہے۔ سوال یہ ہے کہ مجھے اکثریّت کا اعتماد حاصل کرنا ہے یا نہیں۔ اگر مجھے اکثریّتی فرقے کا اعتماد حاصل کرنا ہے، تب یہ بات میرے لیے ضروری بن جاتی ہے کہ میں مسلمانوں کو مطمئن کر سکوں کہ جس طرح ہندوؤں کی آیندہ امّیدیں اور تمنّائیں محفوظ ہیں، اسی طرح مسلمانوں کا مستقبل اور ان کے ارادے بھی ہندوستان

کے ساتھ رہنے میں محفوظ ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ایک طرف سے جموّں میں ریاست کو مکمّل طور ہندوستان کے ساتھ مدغم کرنے کی ایجی ٹیشن نے تباہ کن اثرات پیدا کر کے کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے۔ دوسری طرف سے مسلمانوں کا درمیانی طبقہ اس بات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے کہ جہاں ہندوستان کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے ہندوؤں اور سکھ بھائیوں پر ترقّی کے بے شمار دروازے کھل گئے ہیں۔ وہاں مسلمان کنویئں کا مینڈک بن کر رہ گیا ہے ہماری پالیسی کے نکتہ چینوں نے اس حقیقت کو ہمارے خلاف استعمال کیا ہے۔ جو محکمے براہِ راست ہندوستان کے ہاتھ میں ہیں مثلاً فوج، ڈاک اور تار۔ ان میں سے مسلمانوں کی نمائندگی نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں تنزّل واقع ہوا ہے۔ مسلمانوں کا روشن خیال طبقہ ہندوستان میں ایک معیّن اور ٹھوس مفاد دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ اب کشمیری عوام کے دلوں میں خوف و ہراس کی جگہ معزولی اور شکست نے لے لی ہے اور احساسِ شکست نے ان کی نگاہوں سے پردے ہٹا دیے ہیں۔ یہ وہ صورتِ حال ہے، جس کو میں نے گذشتہ تقریروں میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

تلخ حقیقت

یہ موقع کے ملحق حقائق اور کڑوے واقعات ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان سے ہندوستان اور کشمیر کے بھی خواہ خبردار ہو جائیں۔ آنکھیں بند کر کے حقائق سے مُنہ موڑنے اور یہ فرض کرنے سے کہ سب خیریّت ہے اور حالات کو راہ پر لانے کے لیے

کسی کوشش کی ضرورت نہیں، کوئی مفید مقصد برآمد نہیں ہوگا جہاں تک نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کا تعلّق ہے، ہم اپنے اصولوں پر پابند ہیں۔ ہمارا یہ عہد کہ ہم عوام کو لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے پنجہ سے آزاد کرائیں گے، بدستور قائم ہے۔ ہم تمام انسانوں کے حقوق کے لیے لڑیں گے۔ خاص کر اُن کے جن کو پامال کیا گیا ہے۔

کشمیر کے مستقبل کی بُنیاد

نیشنل کانفرنس جہاں دستاویزِ الحاق کی تائید کرنے کا وعدہ کر چکی ہے، وہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتی ہے کہ سب سے پہلے موجودہ غیر یقینی صورتِ حال کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ ذیل کے سوالات اس صورتِ حال سے متعلّق ہیں :۔

۱ - کیا ہندوستان کے عوام خاص کر لداّخ اور جموّں کی اکثرّیت ہند اور کشمیر کے موجودہ تعلّق کو، جس کی بنیاد معاہدۂ الحاق اور دہلی اگریمنٹ پر ہے، قطعی مان لیں گے۔ اور آیندہ کسی جابرانہ یا کسی دوسرے طریقہ سے اس میں ترمیم کرانے کی کوشش نہیں کریں گے؟

۲ - کیا بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر ہند اور کشمیر کا موجودہ تعلق، جس کی بُنیاد معاہدۂ الحاق اور دہلی اگریمنٹ پر ہے کسی تبدیلی کا تابع نہیں ہو سکتا؟

۳ - کیا ریاست کے تمام لوگ ہند اور کشمیر کے اس تعلّق کی بنیاد

پر بلا امتیاز مذہب و ملت یکساں حقوق اور فوائد حاصل
کریں گے ؟

۴ - کیا موجودہ تعلقات کے ہوتے ہوئے ریاست کی جغرافیائی اور
قدرتی رکاوٹوں اور مشکلوں پر غالب آنا ممکن ہے، جو رکاوٹیں
ریاست کی مجموعی ترقی اور خوشحالی کو روکے ہوئی ہیں ؟

مجھے یقین ہے کہ مسئلہ کشمیر کی باریکیوں کو واقعاتی طور پر اور
خالی الذہن ہو کر سمجھنے سے اس مسئلے کی اصلی صورت کو دیکھ سکیں گے۔
اس طرح اس کا عملی حل نکل آئے گا اور موجودہ اذیت رساں تعطل کا خاتمہ
ہو گا۔"

جدّوجہدِ آزادی اور کشمیری صحافت

جدّوجہد آزادی اور کشمیری صحافت

گو برِّعظیم پاک وہند میں ایک نئے صحافتی دَور کا آغاز ہو چکا ہے اور صحافی اَب غیر ملکی حکومت کے جبر و استبداد سے محفوظ ہو گئے ہیں مگر اِسی خطۂ ارض کے ایک حسین مگر جُھلسے ہوئے گوشے میں صحافیوں کی کشتی ابھی تک اُسی "بھنور" میں ڈول رہی ہے، جس سے ہند و پاک کے صحافی ایک عرصہ بیتا، گزر کر ساحلِ مراد تک جا پہنچے ہیں۔
یہاں پر میری مراد ریاست جمّوں وکشمیر کے صحافیوں سے ہے

صحافتِ کشمیر کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ اس پودے کی آبیاری اُس قوم کے سپوتوں نے کی، جن پر قرنہا قرن سے ظالم و جابر حکمران مسلّط تھے ان میں سے صرف ڈوگرہ اُمروں کا عہدِ حکومت ایک سو چھ سال سے زیادہ ہے۔ اس طویل زمانۂ غلامی میں ان حاکموں نے اپنی رعایا سے جو سلوک روا رکھا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ پھر ایسے محکوم لوگوں سے بغاوت کی آواز بلند ہونی معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔
کشمیری ہندو پنڈتوں کی جدّوجہد یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان مطلق العنان

اور جابر حکمرانوں کے جور و ستم کے شکار صرف مسلمان ہی نہ تھے بلکہ کشمیری پنڈت بھی اُن کا نشانۂ ستم بنے۔ اِن کشمیری پنڈتوں نے حکومتِ کشمیر کے اس سنگدلانہ طرزِ عمل کے خلاف احتجاج بلند کیے اور پھر حق کی یہ صدا بلند کرنے کی پاداش میں وطن سے نکالے بھی گئے۔ اس ظلم و تعدی نے عام طور سے کشمیری کو ایک ایسے احساسِ کہتری میں مبتلا کر دیا جس نے نہ صرف ان کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو منجمد بنایا بلکہ سماجی طور پر درجۂ انسانیت سے بھی گرا دیا، اس کی وجہ سے یہ اپنے ہی دیش میں "اجنبی" اور دیارِ غیر میں "ہتو" بن کر رہ گئے۔

آخر اِن غریب الدیار محنت کشوں کی نسلوں نے اپنے زنگ آلود ذہنوں کو صاف کر کے اپنی فطری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے ذہنوں میں انقلاب مچلنے اور کروٹیں لینے لگا۔ اور لوگ مجبور ہو کر رہ گئے کہ وہ اہلِ کشمیر کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کا اعتراف کریں۔ عظیم جاپانی ادیب "جی ونکاٹم" مصنّف "دخترِ صبحِ صادق" (DAUGHTERS OF DAWN) لکھتا ہے:۔

"ایک کشمیری کو اپنے وطن میں کافی ناکامی و نامرادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ بیرونِ وطن بہت کامیاب و کامران ہوتا ہے"——

کشمیر سے بھاگے ہوئے انسانوں کو ہندوستان کی فضا بہت حد تک راس آئی۔ اور یہاں کے سیاسی ماحول نے اُن کے ذہنوں کو ایسی جلا بخشی کہ سینوں میں دبی ہوئی "آتشِ چنار" بھڑک اُٹھی، جس کے زیرِ اثر انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی آزادی کے لیے سعی شروع کر دی۔ اس جد و جہد کی پہلی کڑی ہندوستان سے

"کشمیریوں کے اخبارات" کا ابھرا تھا، جن کا ذیل میں مختصراً جائزہ لیا جائے گا۔

مراسلۂ کشمیر تارک الوطن کشمیری عوام نے بالخصوص پنڈتوں نے لاہور میں آکر ایک تنظیم قائم کرلی تھی جس کا مقصدِ وحید ریاستی عوام کے دکھ درد کی داستان برطانوی ہندوستان کی حکومت کے گوش گزار کرنا تھا۔ اپنی اس آواز کو باا ثر کرنے کے لیے انھوں نے ۱۸۸۰ء میں "مراسلۂ کشمیر" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا، جس میں کشمیر کے مہاراجہ کے معاندانہ طریق کار کی مذمت بھی ہوتی اور کشمیری کو بیدار کرنے کی نوید بھی۔ یہ اخبار ۱۸۹۰ء تک جاری رہا اور اپنے مشن پر مضبوطی سے ڈٹا رہا۔

خیر خواہِ کشمیر پنڈت ہرگوپال کول خستہ نے جو ریاست میں ایک مشہور وکیل تھے اور اپنے اندر حب الوطنی کا جذبہ رکھتے تھے، مہاراجہ کشمیر کی انسانیت کُش پالیسی کے خلاف آواز اٹھائی، جس کی بنا پر کشمیر سرکار نے ان کو نہ صرف سخت اذیتیں دیں بلکہ ریاست بدر بھی کردیا اور یہ نہایت ہی کس مپرسی کی حالت میں لاہور آبسے۔ مگر وہ مردِ حری اس تلخ و پریشان کن دور میں بھی اپنے بھائیوں کی کلفتوں کو نہ بھولا اور اُس نے کشمیری عوام کی حالتِ زار پر کئی کتابیں تصنیف کرڈالیں جو آج بھی اُس جلاوطن مدبر کی خدماتِ قومی کی یاد دلارہی ہیں۔ آخر ۱۸۸۲ء میں پنڈت خستہ نے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے "خیر خواہ کشمیر" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا، جسے اہل پنجاب نے بے حد پسند کیا۔ اور یہ اخبار اس وقت تک جاری رہا جب تک پنڈت خستہ بقیدِ حیات رہے۔

اخبارِ عام کشمیر کے ایک اور ادیب و مؤرخ پنڈت مکند رام گرتو بھی لاہور

میں مقیم تھے انھوں نے "اخبارِ عام" کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا، اس اخبار کا نصب العین بھی کشمیریوں کی رودادِ غم شائع کرنا تھا۔ اس اخبار کی مقبولیت کا یہ عالم ہوا کہ پنڈت گرتو کے صاحبزادے گوپی ناتھ نے اس کو باقاعدہ روزانہ اخبار کی شکل دے دی۔ اس دوران میں پنجاب کے دو مقامی اخبارات "راوی" اور "پبلک نیوز" نے بھی کشمیریوں کے مسائل میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ اور جو تحریک کشمیری صحافیوں نے شروع کی تھی، اس کا آہستہ آہستہ اثر ہندوستان میں پھیلنے لگا!!!

کشمیر درپن سر تیج بہادر سپرو کے آبا و اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے اور مہاراجہ کشمیر کے ظلم کا نخچیر ہونے کے باعث الٰہ آباد (یوپی) میں آ بسے تھے۔ انھوں نے بھی کشمیر کے مسائل میں بڑا حصہ لیا اور ۱۸۹۶ء میں "کشمیر درپن" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس رسالہ کی ایک خوبی یہ تھی کہ یہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ کشمیری کی غم انگیز حالت ہمالیہ کی چوٹیوں سے لے کر راس کماری تک پھیل گئی۔ سر تیج بہادر سپرو نے ہمیشہ ہی برطانوی حکومت کو کشمیر کے بارے میں یادداشتیں ارسال کیں اور وہ حتی المقدور کشمیریوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے۔ یہاں یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ پنڈت تیج بہادر سپرو کو پنڈت جواہر لعل نہرو کی موجودہ کشمیر سے متعلق پالیسی سے شدید اختلاف تھا۔

اُس دور میں لاہور سے بیشتر کشمیری اخبارات شائع ہوئے، جن میں پنڈت مکند مشیر کا "کشمیر پرکاش" قابلِ ذکر ہے۔ یہ پرچہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ کشمیری پنڈتوں نے کشمیر سے آنے کے بعد تحریر و تقریر سے مہاراجہ کشمیر کے خلاف پنجاب کی "فضا کو مکدر" کر دیا جس نے حکومت کے ایوانوں میں ہلچل پیدا کر دی اور

اس ساری جدّوجہد کا سہرا جہاں دیگر سیاسی لیڈروں کے سر پر تھا، وہاں پنڈت لچھمن نرائن کول اور پنڈت دینا ناتھ مست بھی قابلِ ذکر تھے جنھوں نے ڈوگرہ سامراج پر کھُلی تنقید کی اور ماہنامہ "سفر" اور "صبحِ کشمیر" کے نام سے دو رسائل جاری کیے .... یہ رسائل بھی ہندی اور اردو دونوں میں شائع ہوتے تھے "بہارِ کشمیر" بھی اِسی دور کا ایک پرچہ تھا جو کشمیری پنڈتوں کی ایسوسی ایشن کا ترجمان تھا۔ اس رسالہ میں کشمیر کے علاوہ پنجاب کے مشہور ادیب بھی لکھتے تھے۔

اس جدّوجہد کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ برطانوی حکومت نے ریاست کشمیر کے معاملات میں مداخلت کرنی شروع کر دی۔ اور یہ بات ہندوؤں کو سخت ناگوار گزری، مگر افرنگی کشمیر فروخت کرنے کی جو غلطی کر چکا تھا اب اس کے ازالہ کی یہی صورت تھی کہ وہ اس گڑبڑ سے فائدہ اٹھائے۔ اس لیے انگریزی حکومت نے یہ تدبیر کی کہ گلاب سنگھ کی موت کے فوراً بعد ہی ریاست میں نہ صرف اپنا ریذیڈنٹ بھیج دیا بلکہ ایک انتظامیہ کونسل بھی مقرر کر دی لیکن ہندوستان کے متعصّب ہندو پریس اور لیڈروں نے مہاراجہ کشمیر کا ساتھ دیا۔ اور مہاراجہ کشمیر کی سنگین گرفت نرم ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اور حالات جوں کے توں ہی رہے۔ غرضیکہ وطن سے نکلا ہوا کشمیری صحافیوں کا یہ قافلہ اپنی بےبسی اور بےچارگی پر خون کے آنسو روتا اپنی داستانِ غم لکھتا ہی رہا اور بقولِ غالب ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

مسلمان صحافیوں کا حصّہ اوپر میں نے خاص طور پر کشمیری پنڈتوں کی

مساعیٔ جمیلہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اب میں کشمیر کے مسلمان اخبار نویسوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں انھوں نے اس میدان میں بعد میں قدم رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کشمیری پنڈتوں سے نسبتاً کم خواندہ تھے۔ اور جب تعلیم کی روشنی سے بہرہ ور ہوئے تو وہ بھی اس خارزارِ صحافت میں کود پڑے۔ نہ صرف کود پڑے بلکہ عظمتِ وطن کی ناموس کے لیے برسرِ پیکار ہو گئے۔ پنجاب میں کشمیری صحافیوں میں مولانا تاج الدین تاج سرِفہرست ہیں، جنھوں نے ۱۹۰۱ء میں "گلشنِ کشمیر" کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا اور کشمیر کے حالات کی ترجمانی کر کے ہندو ہمعصر مقامی اخبارات کی مہاراجہ نواز پالیسی کو ہدفِ تنقید بنایا۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ اسی دور میں بابائے صحافت حضرت مولانا ظفر علی خاں نے بھی اپنے مشہورِ عالم اخبار "زمیندار" میں کشمیر کے بارے میں مضامین اور انقلاب آفریں نظمیں لکھنی شروع کیں۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ پنجاب کی صحافت میں کشمیر ایک مستقل موضوع بن گیا۔ اس مستقل موضوع سے سب سے زیادہ عشق اور لگاؤ مولانا محمد الدین فوقؔ کو ہوا جنھوں نے کشمیر کے مسائل کو گویا اپنی زندگی میں سمو لیا۔ اور وہ کشمیر کے سب سے مستند مؤرخ تسلیم کیے جانے لگے۔ اس نیک طینت اور عظیم اہلِ قلم نے کشمیریوں کی جو خدمت کی ہے اُسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آج اگر فوقؔ کی تصانیف موجود نہ ہوتیں تو کشمیریوں کی آیندہ نسلوں کو اپنی تاریخ جاننے اور سمجھنے میں خاصی مشکلات پیش آتیں۔

پنجۂ فولاد مولانا محمدؐ الدین فوقؔ نے ۱۹۰۱ء میں "پنجۂ فولاد" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس کے بعد "کشمیری گزٹ"، "کشمیری مخزن" اور

اخبار "کشمیر" جاری کیے اور یہ سلسلۂ اشاعت ۱۹۳۵ء تک جاری رہا۔

مولانا فوقؔ اپنے ایک رفیق خواجہ کمال الدین کے ساتھ کئی بار کشمیر گئے اور اپنے مشاہدات کی بنا پر کشمیریوں کی سماجی زندگی پر پابندیوں، شہری آزادی، مذہبی آزادی، اقتصادی بدحالی اور طبقاتی تقسیم کے بارے میں مضامین تحریر کرتے رہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ذہنی انقلاب ۱۹۳۱ء میں ایک عملی تحریک کی صورت میں ایک آتش فشاں کی طرح بہہ نکلا جس سے حکومت کی آمرانہ بنیادیں ہل گئیں۔ کشمیر کے متعلق مولانا فوقؔ اور ان کے رفقاءِ کار کی خدمات سے علامہ اقبالؔ بھی بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے یہاں تک کہہ دیا ؎

کہکشاں میں آکے اختر مل گئے
اِک لڑی میں آکے گوہر مِل گئے
واہ واہ کیا محفلِ احباب ہے
ہم وطن غربت میں آکے مل گئے

اور دوسری جگہ فرمایا ؎

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دُور
یا نافۂ غزال ہُوا ہے ختن سے دُور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دُور

علامہ اقبالؔ

یہ بات کشمیری عوام کے لیے سرمایۂ افتخار اور باعثِ عزّت ہے کہ علامہ اقبالؔ بھی اُن کی قوم ہی کے ایک مایۂ ناز سپوت

ہیں۔ علامہ مرحوم نے ویسے تو تمام عالمِ انسانیت کے لیے نغمے الاپے مگر انھوں نے اپنی کشمیری قوم کی حالتِ زار کو بھی نظر انداز نہیں کیا انھوں نے کشمیریوں کے بارے میں اشعار ہی نہیں لکھے بلکہ وہ ان کی جدّوجہدِ آزادی میں شریک بھی رہے اور ایک وقت میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی سرگرمیوں میں حصّہ لیا اور اس کے نگران بنے۔ انھوں نے کشمیریوں کو آپس میں مل جُل کر رہنے کی بار بار تلقین کی، لیکن افسوس کہ ہمارے سیاسی رہنماؤں نے حکیم الاُمّت کے زرین اقوال پر عمل نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم پھر نکبت و ادبار میں مبتلا ہو گئی۔ علامہ اقبال کی دُور رس نگاہوں نے اس بات کو بھانپ لیا تھا کہ ان کا نفاق منزلِ مراد تک پہنچنے میں حائل ہو گا اس لیے انھوں نے شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو تحریک کے ابتدائی دَور ہی میں ایک خط لکھا، جس کا متن یہ ہے :۔

لاہور

۱۲ ر اکتوبر ۱۹۳۳ء

ڈیر شیخ عبداللہ صاحب۔ السّلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ مسلم کانفرنس کشمیر کے اخبار پڑھ کر بے حد خوشی ہُوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزرگانِ کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ اس بات کے لیے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بار آور کرے گا، لیکن مختلف جماعتیں سنا ہے جو کہ بن گئی ہیں، اُن کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہو گا

ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے ہندی مسلمان کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑتے رہے ہیں کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی۔ اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے۔ بلکہ اس وقت بھی بنے ہوئے ہیں۔ بہرحال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔ افسوس ہے کہ میں اور مشاغل کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

محمد اقبال۔ لاہور

علامہ اقبالؒ کے مندرجہ بالا مکتوب سے یہ چیز واضح طور پر عیاں ہے کہ جہاں ان کو کشمیری اخبارات کے مطالعہ سے خوشی ہوئی، وہاں انھوں نے ان اخبارات سے اس بات کو محسوس کیا کہ اخبارات میں "پارٹی بازی" کی وبا جنم لے رہی ہے اس چیز کے سدِ باب کے لیے انھوں نے کشمیری رہنماؤں کو ہم آہنگ ہونے کی تلقین کی، مگر افسوس کہ ان کی یہ بروقت نصیحت صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

خیر آمدم برسرِ مطلب، اس دور میں پنجاب کے بیشتر اخبارات جن میں "رفیق ہندوستان"، "آئینہ ہند" اور "ہمدرد ہند" قابلِ ذکر ہیں، کشمیر کے کوائف کو موضوعِ سخن بناتے رہے اور یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ "ہمدرد ہند" کا داخلہ جس کے مدیر سروپ دیال پنڈت تھے ریاستی حکومت نے بند کر دیا۔ اسی دور میں لاہور سے "راجپوت گزٹ" اور امرتسر سے "کشمیر" اخبارات جاری ہوئے جن میں اول الذکر مہاراجہ کشمیر کی مدح سرائی کا نقیب تھا۔ پنجاب کے ان اخبارات کی مخالفت سے مہاراجہ کشمیر سٹپٹا اٹھے اور اس کا

ردِّ عمل یہ ہوا کہ اُن کی حکومت نے اپنی گرفت کو مضبوط تر کرنے کے لیے انتہائی وحشیانہ طریقِ کار اختیار کر لیا۔ مگر اس سے جذبۂ حرّیت دبا نہیں بلکہ اور زیادہ اُبھرا۔ (کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ جتنا کسی چیز کو دبانے کی کوشش کی جائے اتنی ہی تیزی سے وہ اُبھرتی ہے) یہی بات ریاست میں بھی ہوئی اور وہاں کے عوام خصوصاً دانش ور طبقے پریس کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ شیخ غلام حیدر چشتی نے جو اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر تھے، سیالکوٹ سے "رفیق" کے نام سے ایک پرچہ شائع کیا، جو ریاست بھر میں تقسیم ہوتا تھا۔ یہ پرچہ بے حد مقبول ہوا۔ بعد میں اس پرچے نے "خورشید" کا روپ دھارا، جسے حضرت قیس شروانی ایڈٹ کرتے تھے۔

ذکر انقلاب کا پنجاب کے جن صحافیوں نے تحریکِ کشمیر میں بڑے زور شور سے حصّہ لیا، ان میں جہاں حضرت مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد الدین فوق۔ مولانا سید حبیب اور ایڈیٹر الفضل قابلِ ذکر ہیں، وہاں صحافتِ پنجاب کے دو "دُرِ شہوار" بھی شامل ہیں۔ میرا مطلب یہاں پر مولانا غلام رسُول مہر اور مولانا عبد المجید سالکؔ مرحوم سے ہے۔ جنھوں نے واقعتہً کشمیر کے معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ بنا لیا اور اس سلسلے میں کشمیری قوم کی اتنی خدمات کیں جن کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو احسان فراموشی ہوگا۔

اُس وقت کشمیر میں صحافت کی کیا حالت تھی؟ اور نامہ نگاروں کو کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس کا ذکر حضرت سالکؔ اپنی کتاب سرگزشت میں یوں کرتے ہیں:۔

"کشمیر میں ڈوگرہ راج کے ظلم و ستم اور مسلمانوں کی مظلومی و کس مپرسی کے خلاف "انقلاب" میں بے شمار مراسلات شائع ہوئے اور بہت سے مضامین لکھے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیر کے اندر تمام پڑھے لکھے لوگ "انقلاب" پڑھنے لگے۔ اور رفتہ رفتہ عوام میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ "انقلاب" میں اس مہم کا آغاز یوں ہوا کہ اس سے پیشتر ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے جموں کے بعض کارکنوں نے لاہور میں ایک انگریزی اور ایک اردو روزنامے میں مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت کے خلاف مضامین لکھے، چند ہی ہفتوں کے اندر اندر ان اخباروں کے ایڈیٹروں نے چند ٹکوں کی خاطر حکومت کشمیر سے رابطہ پیدا کر لیا اور مراسلہ نگاروں کے نام ظاہر کر دیے۔ جن پر مہاراجہ کا عتاب نازل ہو گیا اور کارکنوں میں وحشت پھیل گئی۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد جموں کے ایک اخبار نویس دوست لاہور آ کر مجھ سے ملے اور کشمیری مسلمانوں کے دکھ کی داستان سنائی۔ میں نے کہا 'انقلاب' آپ کی ہر خدمت پر آمادہ ہے، کیونکہ ایک تو ہر مظلوم مسلمان کی حمایت ہمارا فرض ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی رہتا ہو۔ دوسرے کشمیری مسلمان ہمارے ہمسایہ اور گوشت پوست ہیں، جب تک کشمیری مسلمان آزاد ہو، پنجاب اور صوبہ سرحد اور سندھ کے سیاسی حالات کچھ معنی نہیں رکھتے۔ وہ کہنے لگے ہمیں اندیشہ ہے کہ مبادا ہمیں 'انقلاب' سے بھی وہی ضرر اٹھانا پڑے جو ہم اس سے پیشتر فلاں فلاں اخبار سے

اٹھا چکے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے قومی غداری اور صحافتی بد دیانتی کی وہ داستان سنائی، جس پر میں نے ان سے کہا کہ آؤ قرآن مجید پر حلف اٹھائیں۔ تم قسم کھاؤ کہ تم "انقلاب" میں جو کچھ لکھو گے یا جو واقعات ایڈیٹر کی اطلاع کے لیے قلم بند کرو گے، ان میں ذرہ بھر بھی جھوٹ یا اشتباہ کی گنجائش نہ ہوگی، بلکہ ہر بات پوری تحقیق کے بعد درج کرو گے۔ اس کے مقابلے میں میں قسم کھاتا ہوں کہ "انقلاب" کے دفتر یا میرے قبضے سے تمہاری کسی تحریر کا ایک لفظ بھی مہاراجہ کے یا اس کے حکام تک نہ پہنچ سکے گا۔ میں دس لاکھ روپیہ پر بھی لات مار دوں گا اور جیل خانہ میں جانا گوارا کر لوں گا، لیکن کسی قومی کارکن یا اپنے کسی نامہ نگار کا راز فاش نہ کروں گا۔ یہ مطمئن ہو گئے چنانچہ ہم نے حلف کے بعد زور شور سے کام شروع کر دیا۔"

"انقلاب" کی اس حق گوئی کی بنا پر ریاست میں اُس کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ کشمیری نامہ نگاروں کی بہم شدہ اطلاعات نے ریاست بھر میں آگ لگا دی اور اس سلسلے میں حکومت نے سخت احکام نافذ کر دیئے۔ مگر جو آگ لگی تھی وہ تدبیروں اور سختیوں سے رُک نہ سکی۔ اس دور میں ریاست میں کیا حالت تھی۔ اس کا ذکر منشی معراج الدین احمد صاحب ایڈیٹر "پاسبان" سے سنئے:-

"یکم نومبر ۱۹۳۱ء کو مسٹر اے۔ آر۔ ساغر ۳۰ رضاکاران ینگ مینز ایسوسی ایشن کو لے کر سول نافرمانی کی مہم کو روانہ ہوئے۔ ادھر انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور ادھر معزز جریدہ "انقلاب" لاہور کے پرچے رضاکاروں کے ہاتھوں میں بلند ہوئے یہ وہ وقت تھا کہ ریاست

میں اسلامیانِ ہند کے دو ممتاز ترین روزناموں انقلاب اور سیاست کا داخلہ بند تھا۔ اور مسٹر ساغر نے تحریک آزادی کشمیر کو تیز تر کرنے کے لیے سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ یکم نومبر کا دن براہِ راست ڈوگرہ سامراج سے ٹکرا جانے کا دن تھا۔ مسٹر ساغر کو معہ ان کے ساتھیوں کے گرفتار کر لیا گیا۔"

(پاسبان یکم نومبر ۱۹۶۱ء)

بعدازاں بھی ساغر صاحب آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے دماغ کہلائے۔ اور انھوں نے اپنی آتش بیانی اور شعلہ نوائی سے سوتے ہوئے کشمیری مسلمانوں کو جگا دیا۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا، جس کا ذکر اپنے مقام پر آگے آئے گا۔

غرضیکہ "انقلاب" کے ریاست میں بند ہو جانے کے بعد سالک و مہر نے "کشمیری مسلمان"، "مظلوم کشمیر"، "مکتوب کشمیر" کے نام سے اخبارات شائع کیے، جنھیں ریاست کی حکومت بند کر دیتی اور انھیں تقسیم کرنے والوں کو پابندِ سلاسل بنا دیتی۔

ریاست کا اوّلین اخبار

مہاراجہ ہری سنگھ کے سامنے جن دنوں وہ مہاراجہ کشمیر کی کونسل کا ممبر تھا جموں کے ایک ہندو ادب دوست نوجوان لالہ ملک راج صراف نے ایک ہفتہ وار اخبار نکالنے کی درخواست دی، جسے ہری سنگھ نے مسترد کر دیا۔ لیکن اس باہمت نوجوان نے ہمّت نہیں ہاری اور آخر وہ تیسری بار ۱۹۲۴ء میں چند ایک شرائط پر اخبار کا ڈیکلریشن لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ملک راج صراف کا "رنبیر" اخبار ریاست کشمیر کا

اوّلین پرچہ تھا۔ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث اس نوجوان نے اپنا پریس لگوایا جس کا نام پریم پرنٹنگ پریس تھا۔ بعد میں اس ادارے نے بہت ترقی کی۔ اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں بڑا حصّہ لیا۔ بچّوں کا مشہور رسالہ "رتن" اسی ادارے سے تعلق رکھتا تھا، جسے مشہور جرنلسٹ کندن لال حال پروفیسر، اور ادم پرکاش صراف ایڈٹ کرتے تھے۔ "رہنبر" کی پالیسی کانگریس نواز تھی۔ مگر پنڈت صراف اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہر حلقے میں مقبول تھے۔ ان کے صاحبزادے اوم پرکاش صراف شیر کشمیر شیخ عبداللہ کی پارٹی سے تعلق رکھنے کے باعث اب بھی حکومت کشمیر کے تختۂ مشق ستم بنے ہوئے ہیں۔

پنجاب پریس کے احتجاج، آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی سعی جمیل اور کشمیری عوام کی جدوجہد نے آخر برطانوی حکومت اور کشمیر سرکار کو مجبور کر دیا کہ وہ ریاست میں اصلاحات نافذ کریں، چنانچہ گلینسی کمیشن آیا۔ مڈلٹن کمیشن بھی آیا۔ اور ان کمیشنوں کی سفارشات پر ریاست میں پریس ریگولیشن نافذ کیا گیا۔

گلینسی کمیشن کی سفارشات سے پیشتر ریاست کے ایک مشہور صحافی منشی معراج الدین احمد نے لاہور سے "کرن کشمیر" پرچہ نکالا اور اس میں کشمیر حکومت پر شدید نکتہ چینی شروع کر دی۔ ابھی اس اخبار کے سترہ پرچے نکلے تھے کہ حکومت نے اس کا بھی داخلہ ریاست میں بند کر دیا۔ پھر یہی "کرن کشمیر" یکم جولائی ۱۹۳۲ء کو "پاسبان" کی شکل میں منظر عام پر آیا۔ یہ اوّلین اسلامی اخبار تھا، جس کی تحریروں کا محور مسلمانوں کو بیدار کرنا اور حکومت پر تنقید کرنا تھا۔ اسی باعث "پاسبان" کے کئی شمارے ضبط کئے گئے۔ اور گیارہ بار اسے بلیک لسٹ کیا گیا۔ منشی معراج الدین احمد

نے جب سے یہ اخبار نکالا ہے، اس وقت سے یہ باقاعدگی سے نکل رہا ہے۔ اب یہ اخبار سیالکوٹ سے باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے اور مالی پریشانیوں میں مبتلا رہنے کے باوجود ملک و قوم کی خدمت میں اسی طرح پیش پیش ہے جس طرح پہلے روز تھا اس دور میں غلام حیدر غوری نے "نوجوان" جاری کیا جو اسلامی تحریک کا داعی تھا۔

اب کشمیر کی صحافت کے سلسلے میں ریاست کے ایک تاریخی "نامہ نگار" کے بارے میں بھی کچھ سنئے۔ یہ ایک دور کے نوجوان "نامہ نگار" مشہور کشمیری صحافی عبدالمجید قریشی ایڈیٹر "جمہور" اور حال ایڈیٹر ترجمانِ "کشمیر" ہیں۔ آپ ایک قومی درد رکھنے والے بزرگ ہیں اور منشی معراج الدین احمد اور غلام حیدر غوری اور ریاست کے دیگر صحافیوں کی طرح ساری زندگی اسی شغل میں گزار دی ہے۔ موصوف سیاست میں شیخ عبداللہ کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبدالمجید قریشی کے بارے میں حضرت عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:۔

"عبدالمجید قریشی جموں کے قومی کارکنوں میں بہت ممتاز تھے اور چودھری غلام عباس اور اللہ رکھا ساغر کے ساتھ ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ان کا ہفتہ وار اخبار "جمہور" ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن اور مسلم کانفرنس کے مطالبات کا حامی تھا اور ہمارے ساتھ قریشی صاحب تعلقات اس لیے اور بھی زیادہ گہرے ہوگئے کہ وہ ریاست جموں و کشمیر میں "انقلاب" کے ممتاز ترین نامہ نگار تھے اور مجھے دل سے اعتراف ہے کہ قریشی صاحب نے انقلاب میں کشمیر کے مسائل پر جو کچھ لکھا، وہ صحت و احتیاط کا بہترین نمونہ تھا۔ چنانچہ ان کے بہم پہنچائے ہوئے

واقعات واعداد پر میں نے بار بار حکومت کشمیر کو چیلنج کیا لیکن حکومت کسی چیز کی تردید نہ کر سکی۔"

۱۹۳۲ء میں ریاست کے ہر حصّے سے اخبارات نکلنے شروع ہو گئے جن میں سیاسی، ادبی اور مذہبی سب شامل تھے۔ بیشتر اخبارات کی سرپرستی کشمیری لیڈر کرتے تھے۔ بلکہ کشمیری لیڈر خود ہی ان کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانہ میں صوبہ کشمیر سے جو اخبارات نکلے ان میں "صداقت" "ہمدرد" "خدمت" "مارتنڈ" "اصلاح" "حقیقت" "اسلام" "کشمیر جدید" "البرق" "خالد" "ہدایت" "کیسری" "رہبر" "کشمیر ٹائمز" "نیو کشمیر" "نویُگ" "پیغام" "کشمیر گارڈین" "وکیل" "کشمیر کرانیکل" "حریت" "مرد" "نور" اور "لالہ رخ" قابلِ ذکر ہیں۔

اور صوبہ جموں سے "رنبیر" "پاسبان" "نوجوان" "جمہور" "امر" "ترجمانِ کشمیر" "جاوید" "انند" "چاند" "دیش سیوک" "سدرشن" "کرن" "رتن" "خورشید" "فردوس" "انکشاف" "وطن" "صادق" "آفتاب" "زمیندار" "حمایت" "دیہاتی دنیا" "پریم" اور "کسان" جاری ہوئے۔ جن میں کئی ایک یہاں آنے کے بعد بھی شائع ہوتے ہیں۔

کشمیر کا بین الاقوامی صحافی

کشمیری صحافیوں میں جس صحافی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ وہ پریم ناتھ بزاز ایڈیٹر "ہمدرد" (سری نگر) ہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا امتیاز ان کی حق گوئی اور عزم و ثبات ہے جس نے ان کے صحافتی کردار کو دوسروں پر فوقیت بخشی ہے۔ اپنی دیانتداری اور اصول پرستی کی وجہ سے بزاز کی آواز اب اتنی قابلِ اعتماد ہو چکی ہے کہ لوگوں کو

ان کی بات پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز نے کشمیری صحافت میں ایک نئے رجحان کی بنیاد رکھی اور اپنی رائے کو کسی کے تابع نہ بنایا۔ ان کی تحریریں وقتی، جذباتی یا ہنگامی نہیں ہوتیں بلکہ اس کے پس پردہ کشمیر اور اہل کشمیر سے سچی محبت کا حیات افروز اور مقدس جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ حکومت کشمیر نے ان کو بھی کئی بار قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا۔ یہ آج بھی کشمیر سے باہر جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر وہ اپنے مشن کو نہیں بھولے . . . .

. . . . بزاز کشمیر سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی کتابیں ہی "تحریک آزادئ کشمیر" کا دوسرا نام ہیں۔

مدیر "انصاف" راولپنڈی میر عبدالعزیز بی۔ اے پنڈت پریم ناتھ بزاز کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور صحافت کے میدان میں بزاز کی رفاقت سے آئے ہیں۔

یوں تو مسٹر اے آر ساغر کا شمار جموں وکشمیر کے ممتاز سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے مگر صحافتِ کشمیر میں ان کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ اُن کی تحریریں بڑی خیال انگیز ہوتی ہیں۔ اور اُن میں ایسی حرارت پائی جاتی ہے جو انسان کو کچھ کرنے پر اکساتی ہے۔ وہ ریاست میں "جاوید" کے مدیر و مالک تھے۔ یہ پرچہ بڑا مقبول تھا۔ ان کی تحریر و تقریر سے متاثر ہو کر ایک بار بابائے صحافت حضرت مولانا ظفر علی خان نے فرمایا تھا۔

ساغر سے کہا میں نے کہ اے رونقِ محفل
تحریر تیری شستہ ہے تقریر شگفتہ

اسلام کی دولت تیری گھٹی میں پڑی ہے
موتی تیری جھولی میں ناسفتہ و سُفتہ
جموں کے مسلماں کو دیا درس خودی کا
ہاتھوں سے کیا تو نے خمیر ایک تفتہ
ہم نیند کے ماتوں کو بھی اللہ جگا دے
بیدار ہے دنیا کی ہر ایک ملتِ خفتہ

(ظفر علی خان)

ساغرؔ صاحب ریاست جموں وکشمیر کے پہلے صحافی ہیں، جنھوں نے سب سے زیادہ قید کاٹی۔ ان کی قید کا مجموعی عرصہ سات سال ایک ماہ ہے۔ یہ سات بار پابندِ سلاسل ہوئے۔ بیس بار حکم زبان بندی ملا۔ تین سال تک "جاوید" پر سنسر رہا۔ آجکل راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

شیر کشمیر شیخ عبداللہ کے رفیق خاص مولانا مسعودیؔ بھی کشمیر کے اوّلین اور صفِ اوّل کے صحافیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے صوبہ کشمیر میں صحافت کی ترقی و ترویج کے لیے بہت سی کوششیں کیں۔ اور اپنے اخبار "خدمت" میں حکومت کشمیر کی خوب خبر لی۔ اسی طرح صوبہ کشمیر اور صوبہ جموں کے مندرجہ ذیل صحافی بھی اس دور کی یاد تازہ کرتے ہیں:۔

مولانا صدرالدین مجاہدؔ۔ خان غلام حیدر خان غوری۔ مولانا نورالدین نورؔ۔ کیشب بندھو۔ دیوان نرگس۔ غلام محی الدین۔ شمبھوناتھ کول۔ غلام احمد کشفیؔ خواجہ عبدالغفار۔ ایوب صابرؔ۔ شیخ غلام قادر۔ شونا تھ گپتا۔ مسٹر کیرنیؔ۔

پریم ناتھ در ۔ یوسف قریشی ـــ ان صحافیوں کے علاوہ جن لوگوں نے اپنے پرمغز مقالات اور مضامین سے تحریک کو زندگی بخشی، ان میں خواجہ غلام احمد عشائی ۔ خواجہ عبدالرحیم ۔ مرزا افضل بیگ ۔ غلام حیدر چشتی ۔ ماسٹر غلام حیدر ۔ پروفیسر ایم ۔ اے عزیز ۔ مسٹر کے ۔ ایچ ۔ خورشید اور یوسف صراف قابل ذکر ہیں ۔

اس صحافتی جدّوجہد کا اثر یہ ہوا کہ ریاست میں سیاسی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں کو تسلیم کیا جانے لگا ۔ سیاسی حالات پہلے سے بہتر ہو گئے اور تحریک آزادی مختلف ادوار سے گزر کر واضح نصب العین کی طرف چل نکلی ۔ اس کے بعد ریاست میں صحافت نے ایک اور راستہ تلاش کیا اور یہ ادبی سرگرمیوں کا راستہ تھا اس کی سرپرستی زیادہ تر ان لوگوں نے کی جو بیرون ریاست سے آتے تھے ۔ انھوں نے خاص طور سے ادبی مسائل کی طرف توجہ دی ۔ ان میں منشی سراج الدین ، مرزا جعفر علی اثر لکھنوی ۔ خواجہ غلام السیدین ۔ خلیفہ عبدالحکیم ۔ ڈاکٹر ایم ۔ ڈی تاثیر شامل ہیں ۔ ان لوگوں نے مختلف ادبی مجلسوں کی سرپرستی کی ۔ ان کے زیر اہتمام ادبی جریدے شائع ہونے لگے ، جن میں فردوس قابلِ ذکر ہے

اسی طرح مکتبۂ "چاند" اور مکتبۂ "رہبر" نے اردو کے مشہور ادیبوں کی کی کتابیں شائع کیں ۔ سری نگر میں کئی مکتبے جاری ہوئے ۔ جو کشمیر کے بارے میں کتابیں شائع کرتے تھے ۔

صحافتِ کشمیر کے ضمن میں مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کا ذکر نہ کرنا ایک جرم ہوگا ۔ مولانا ریاست کے ایک حصّے پونچھ کے رہنے والے تھے ۔ مگر اوائل عمر ہی میں ریاست سے باہر چلے گئے ۔ ان کا شمار اردو کے عظیم ترین صحافیوں میں ہوتا ہے

وہ کئی اخبارات کے مدیر رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کام کرتے رہے تقسیم برعظیم کے بعد امروز کے ایڈیٹر بنے اُنھوں نے شیرِ کشمیر کی فرمائش پر "کشمیر" کے بارے میں ایک کتاب بھی تحریر کی "ریاست میں"۔

کچھ ریاستی اخبارات سیاسی جماعتوں کے ترجمان تھے اور کچھ اخبارات کی حیثیت انفرادی تھی۔ اور کئی اخبارات حکومت کی حاشیہ برداری کرتے تھے۔ صرف وہی اخبارات تحریکِ آزادی سے وفادار رہے جن کو کشمیری رہنماؤں کی سرپرستی حاصل تھی۔ بہت سوں کا کام تو محض قوم میں نفرت اور انتشار پیدا کرنا رہ گیا تھا۔

وطن سے ہجرت کے بعد کشمیری لیڈروں نے آزاد کشمیر میں صحافت کی ترقی کے لیے کوئی خاص جدوجہد نہیں کی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان لیڈروں سے اس شعبے کو تقریباً نظر انداز کر دیا، تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ ۱۹۴۹ء — ۱۹۵۰ء میں جب مسٹر کے ایچ خورشید سری نگر جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے، تو انھوں نے مسٹر عزیز بیگ کے ساتھ مل کر لاہور سے انگریزی میں ایک ہفت روزہ اخبار "گارڈین" نکالا، اب موجودہ حکومت آزاد کشمیر جس کے صدر مسٹر کے ایچ خورشید ہیں، انگریزی میں "آزاد کشمیر نیوز" کے نام سے ایک اخبار نکال رہی ہے جس میں آزاد کشمیر کی تعمیر و ترقی اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد کی خبریں چھپتی ہیں۔ مغربی پاکستان کے بعض شہروں سے کشمیری صحافیوں نے متعدد اخبارات و رسائل نکال رکھے ہیں، جو یہاں کشمیر صحافت کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔
